احسن الجوابات

حصہ دوم

آیت اللہ سید جعفر مرتضیٰ عاملی مدظلہ العالی

احسن الجوابات

حصہ دوم

از قلم

آیت اللہ جعفر مرتضیٰ عاملی، لبنان

مترجم

حجۃ الاسلام علامہ اطاف حسین کلاچی

پیش کش

حجۃ الاسلام علامہ ریاض حسین جعفری فاضل قم

ناشر

ادارہ منہاج الصالحین

جناح ٹاؤن' ٹھوکر نیاز بیگ' لاہور فون: 35425372

کتاب	:	احسن الجوابات (حصہ دوم)
ازقلم	:	آیت اللہ جعفر مرتضیٰ عاملی، لبنان
مترجم	:	حجۃ الاسلام علامہ الطاف حسین کلاچی
نظر ثانی	:	حجۃ الاسلام علامہ ریاض حسین جعفری فاضل قم
پروف ریڈنگ	:	ملک ابرار حسین میثم حیدری۔ محمد عمران حیدر جعفری
فنی تعاون	:	زہراء بتول جعفری ۔ محدثہ بتول جعفری
اشاعت	:	اکتوبر 2010ء
صفحات	:	160
ہدیہ	:	[illegible] روپے

ملنے کا پتہ

ادارہ منہاج الصالحین ۔ لاہور

الحمد مارکیٹ فسٹ فلور دکان نمبر 20۔ غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار۔ لاہور

فون: 042-37225252 ، 0301-4575120

ترتیب

پہلا حصّہ
عقائد 12
دوسرا حصّہ
قرآنیات 25
تیسرا حصّہ
قرآن وامامت 41
چوتھا حصّہ
امام اور امامت 80
پانچواں حصّہ
عصمت 96
چھٹا حصّہ
ہجرت 117
ساتواں حصّہ
شہادت آئمہ طاہرینؑ 125
آٹھواں حصّہ
شخصیات 147
نواں حصّہ
متفرقات 156

کچھ اپنے بارے میں

مولائے کائنات جناب امیر المومنین علی علیہ السلام کا فرمان ہے:

كُلُّ وِعَاءٍ يَضِيقُ بِمَا جُعِلَ فِيهِ إِلَّا وِعَاءَ الْعِلْمِ فَإِنَّهُ يَتَّسِعُ

''ظرف اُس میں رکھی جانے والی چیز کے سبب تنگ ہو جاتا ہے لیکن علم کا ظرف علم کے آنے سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے''۔

علم ہی زندگی ہے، علم ہی روشنی ہے لیکن علم انہیں حاصل ہوتا ہے جو اس راہ میں اپنے آپ کو وقف کر دیتے ہیں سوائے کسبِ علم کے۔ ان کا کوئی اور کام ہوتا ہی نہیں ہے۔ شیخ الاسلام انصاری نے کہا تھا:

هٰذَا الشَّانُ شَانُ مَنْ لَيْسَ لَهُ شَانٌ سِوىٰ هٰذَا الشَّانِ

''طلبِ علم ان جوان مردوں کا کام ہے جن کا مقصود بالذات یہی کام ہو''۔

طالب علم کے دو دَور ہوتے ہیں ان دو دوروں میں وہ طلبِ علم کرتا ہے۔

پہلا دور مکتب یا مدرسہ ہوتا ہے اور ایک استاد ہوتا ہے، تیسرا وہ خود ہوتا ہے۔ یہ دور مدرسہ کی چار دیواری اور اُستاد کی نگرانی میں ختم ہوتا ہے۔

دوسرا دور وہ دور ہے جو مکتب سے باہر کا ہے اور اُستاد کی نگرانی کے بغیر ہوتا ہے۔ اس دور میں طالب علم خود شاگرد ہوتا ہے اور خود استاد۔

اس دوسرے دور کے بارے میں مشہور و معروف اسکالر ابن العلماء نے کہا تھا:

مَا دَامَتِ الْحَيَاةُ تَحْسُنُ

"جب تک زندگی ساتھ دے علم حاصل کرو"۔

یہی دورِ کمال کا دور ہے۔ پس طالب علم اور کمال ایک ہی شے کے دو نام ہیں۔

خداوند تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا

"جو لوگ ہمارے لیے جدوجہد کرتے ہیں تو ہم انھیں اپنے راستوں کی ہدایت کرتے ہیں"۔

یہی لوگ ہوتے ہیں جو امر ہو جاتے ہیں۔ جو مرتے نہیں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ یہی علم ہے جو معرفتِ ربانی کے آداب سکھاتا ہے اور رموزِ بندگی کی تعلیم دیتا ہے۔ قرآنِ کریم میں ہے:

إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ

"علماء ہی ہیں جو خشیتِ الٰہی کے امین ہیں"۔

اس لیے انھی لوگوں کے لیے پیغامِ ربانی ہے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً

"جس نے اچھے اچھے کام کیے چاہے وہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو ہم اُسے پاکیزہ زندگی عطا کر دیتے ہیں"۔

یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے وہ اپنے بندوں کو ہمیشہ کی زندگی عطا کرتا ہے۔ اب جب کہ دنیا Global Village بن چکی ہے، انسان کہاں سے کہاں تک جا پہنچا ہے۔ اب انٹرنیٹ کی سہولیات نے اُس کی زحمات کو بہت حد تک محدود کر دیا ہے۔

وہ ایک چھوٹے سے کیبن میں بیٹھ کر پوری دنیا کا مطالعہ کر سکتا ہے۔

اب اُسے ریسرچ کے لیے دنیا بھر کے جامعات کی لائبریریوں میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ گھر بیٹھے سب کچھ کر سکتا ہے، لیکن اس تحقیقی کام کے لیے عقل چاہیے، علم چاہیے، جدوجہد مسلسل چاہیے۔ یہ تمام عوامل ہر جگہ ہر آدمی میں مکمل صورت میں میسر ہیں۔ اگر کہیں یہ سب جمع ہو جائیں تو یہی انسان دنیائے انسانیت کے لیے ایک عظیم الشان تحفہ سے کم نہیں۔

تحقیق کا لغوی مطلب حق تک پہنچنا ہے اور پھر حق تک پہنچنا ایک مشکل ترین عمل ہے۔ میدانِ تحقیق میں وہ لوگ اُترتے ہیں جن کے پاس عزم، ہمت و حوصلہ اور استقامت ہو اور پھر اس کے ساتھ جُہدِ مسلسل بھی ہو۔

تحقیق کے ان صبر آزما مراحل کی طرف رشید حسن خان نے کہا تھا:

''تحقیق مزدوری نہیں ہوتی جس کو شام تک کرنا ہی ہے اور پھر معاوضہ لے کر اور سب کچھ بھول کر الگ ہو جاتا ہے۔ اس میں آنکھوں کا تیل ٹپکانا پڑتا ہے اور دل خون کرنا پڑتا ہے''۔ (رشید حسن خان: ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، الفیصل، لاہور، اکتوبر ۱۹۸۹ء، ص ۸۳)

اب میں مختصر صورت میں اس صدی کے محقق کبیر، الباحث الاعظم سماحۃ آیت اللہ السید جعفر مرتضیٰ عاملی مدظلہ العالی کے بارے میں کچھ عرض کروں گا۔ جس نے اپنی تحقیقات سے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ان کا ایک بہت بڑا کارنامہ ''سیرت نبویؐ'' ہے۔ آپ نے اپنی اس عظیم الشان کتاب کا نام ''الصحیح من السیرۃ النبی الاعظم'' رکھا ہے، جو چونتیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ جس انداز میں آپ نے سیرت پر کام کیا ہے ایسا انداز آج تک کسی کو نہیں ملا۔ آپ نے گذشتہ ادوار کے سیرت کے کام کو خوب دیکھا اور پرکھا جہاں آپ کو توہین رسالتؐ کے پہلو نظر آئے آپ نے ان پہلوؤں پر

مکمل کر بات کی اور خوب آپریشن کیا اور دنیا کے سامنے ان حقائق کو واضح کر دیا جن پر آج تک پردے پڑے ہوئے تھے۔

آپ کا دوسرا عظیم کام سیرت امام علیؑ ہے، جو چونتیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ اتنا بڑا کام ہے کہ آپ نے علمی دنیا میں ایک تلاطم برپا کر دیا ہے۔ اگر مبالغہ نہ ہو تو میں کہہ سکتا ہوں آج تک جتنا کام حضرت امام علی علیہ السلام پر ہوا ہے اگر وہ بحر بیکراں ہے تو یہ ایک سفینہ ہے۔

آپ نے علوم قرآنیہ پر بہت بڑا کام کیا ہے، جو ان کی ویب سائٹ پر موجود ہے۔ یہ کتاب جو اب آپ کے ہاتھوں میں ہے یہ ان کی کتاب مختصر مفید کا ترجمہ ہے۔ اس کتاب میں ان سوالات کے جوابات موجود ہیں جو آپ پر دنیا بھر سے وارد کیے گئے۔ یہ سوالات آپ پر دوستوں کی طرف سے بھی ہوئے اور دوسرے لوگوں کی طرف سے بھی ہوئے لیکن آپ نے ہر اعتبار سے جامع و مانع صفات سے متصف جوابات دیے، جو دوستوں کی تسلی و تشفی کا سامان لیے ہوئے ہیں اور دوسرے لوگوں کی چلتی زبانوں کو لگام دی ہے۔

آپ نے مشکل سے مشکل ترین سوالات کے جواب دیے ہیں۔ یہ ایک علمی گل دستہ ہے جو آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اور آپ کے ہر اُس علمی سوال کا جواب ہے جس کے جواب کی آپ کو تلاش ہے۔

پاکستان کا ماحول کچھ اور ہے لبنان کا کچھ اور ہے۔ تو ہم نے اس کتاب کے ترجمہ میں اپنے ماحول کو مدنظر رکھا ہے۔ جن سوالات اور ان کے جوابات کی ضرورت نہ تھی ان کو حذف کر دیا ہے۔

علامہ ریاض حسین جعفری بانی ادارہ منہاج الصالحین نے علامہ محمد حسن جعفری صاحب قبلہ اور بندہ کے ذمہ یہ کام لگایا کہ اس ضروری کتاب کا ترجمہ ہونا چاہیے۔

پہلا حصّہ جو اَب آپ کے ہاتھوں میں ہے، اس کا ترجمہ علامہ محمد حسن جعفری صاحب نے کیا ہے اور دوسرے حصّہ کا ترجمہ اس عبدِ حقیر نے کیا ہے۔

آیت اللہ السید جعفر مرتضیٰ عاملی کا تعلق لبنان کے علاقہ جبلِ عامل سے ہے۔ جبلِ عامل وہ بقعۂ نور ہے جس کے دامن میں ان جلیل القدر علماء نے جنم لیا جنھوں نے کائنات کو اپنے علم سے نور بخشا۔ علامہ الشیخ العاملی کا تعلق بھی جبل عامل سے ہے۔ شہید اوّل محمد بن جمال الدین مکی العاملی نے بھی اسی مقام پر جنم لیا تھا۔ یہ محقق کبیر بھی اسی علاقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسی خطۂ لبنان جسے جبلِ عامل کہا جاتا ہے اس خطہ سے اتنی بڑی فکری تحریک نے کیوں جنم لیا۔ اس کے کیا اسباب ہیں۔ اتنے بڑے بڑے مفکر، فقیہ۔ لوگ یہاں پیدا ہوئے۔ آخر اس کے عوامل کیا ہیں؟

جبلِ عامل سوریا کبریٰ کا حصّہ ہے، جو جنوبی لبنان میں واقع ہے۔ اصل اس کا نام "عاملہ" ہے اور یہ علاقہ عاملہ بن سبا کے نام سے منسوب ہے۔ یہ شخص یمن کا رہنے والا تھا۔ وہاں سے لبنان کے اس پہاڑ میں آکر آباد ہوگیا۔ پھر اس کے نام کے ساتھ یہ پہاڑ جبلِ عاملہ کے نام سے مشہور ہوگیا۔ کثرتِ استعمال کی وجہ سے جبلِ عاملہ، جبلِ عامل ہوگیا۔

اب اس سوال کا جواب کہ یہ علاقہ ایک عظیم فکری تحریک کا مرکز کیسے بنا۔ جب جبلِ عامل کی تاریخ کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو کوئی اور بات تو سامنے نہیں آتی۔

جی ہاں! صرف یہ بات سامنے آتی ہے کہ جب ایک صحابیِ جلیل جس کی شان میں پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا تھا: "زمین و آسمان کے درمیان اگر کوئی اَصدق لہجہ ہے تو یہی ہیں"۔ جب اس نے اپنی پُروقار لسان کو حق و صداقت کے پرچار کے لیے استعمال کیا تو اُس وقت کے اربابِ بست وکشاد نے انھیں جلاوطن کر دیا تھا۔ جب وہ

ملک شام پہنچے تو انھوں نے اسی جبلِ عامل میں اپنی تبلیغات کا کام شروع کر دیا تھا اور یہاں اہلِ بیتؑ رسول اللہ کی محبت کا بیج بویا۔ پھر اُسے اپنے جگر کے خون سے سینچا۔ ایک زمانہ آیا اسی وادی میں شہید اوّل اور الشیخ الحر العاملی نے جنم لیا۔ ابھی انھی بزرگواروں کے چمن کی خوشبو سے کائنات معطر تھی کہ اسی وادی میں آیت اللہ سید جعفر مرتضٰی عاملی نے جنم لیا۔ پھر اپنے بزرگواروں کی تحریک کو چار چاند لگا دیے۔

جس صحابی جلیل کی عظیم الشان قربانیوں سے یہ علمی وفکری تحریک نے جنم لیا تھا ان کا تعلق عرب کے مشہور قبیلہ غفار سے تھا اور آپ کا نام نامی ابوذر غفاریؓ ہے۔

اس کتاب کی اشاعت کے بعد ادارہ منہاج الصالحین نے عزم کر رکھا ہے کہ سیرت امام علیؑ کا ترجمہ جلد قارئین کرام کے حضور پیش کر دیا جائے گا۔

والحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علی محمد وآلہ الطاهرین

وادیٔ علم ومعرفت کا ایک متلاشی

والسلام

الطاف حسین کلاچی

عرضِ مجیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله والصلاة والسلام علی رسول الله محمد وآله الطاهرین ، واللعنة علی اعدائهم اجمعین من الاوّلین والاخرین الی قیام یوم الدین

جب انسان کسی امر سے آگاہ نہیں ہوتا تو اُسے ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اُس سے آگاہی حاصل کرے۔ اسی حصول کی کاوش کا نام سوال ہے۔

جب سوال کا جواب اُس کے سامنے آتا ہے تو اُس جواب کی حیثیت اُس دوا کی سی ہوتی ہے جو ایک مریض کو شفا بخشتا ہے، اور ضمیر کو راحت وسکون دیتا ہے۔ اگر سوال کا جواب شافی صورت میں نہ ہو تو پھر ایک اور صورت جنم لیتی ہے جسے بحث و تمحیص کا نام دیا گیا ہے۔

مجھ پر کثرت کے ساتھ سوالات ہوئے ہیں، جو نا قابلِ شمار ہیں۔ میں نے ان تمام سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کی ہے لیکن اختصار کو مدنظر رکھا ہے۔ بھرپور کوشش کی ہے کہ جواب کافی اور وافی ہو، تا کہ قاری کے لیے ہر اعتبار سے نافع ہو لیکن ہمیں اپنی کم مائیگی کا بھی اعتراف ہے۔ ہم اپنے آپ کو قول وفعل کے اعتبار سے معصوم نہیں سمجھتے۔

ہم اپنے قاری کی خدمت میں عرض گزار ہیں کہ کہیں کوئی انھیں خلل یا خطا نظر آئے تو ہماری رہبری کریں۔

خداوند تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں قول وفعل کے خلل وزوال سے محفوظ رکھے۔

سید جعفر مرتضیٰ عاملی

پہلا حصہ

عقائد

عدل الٰہی و قضایا سلوک

سوال جناب عالی! دو آدمیوں کے بارے میں عدل الٰہی کی آپ کیا تفسیر فرمائیں گے۔ ایک آدمی مومن کے گھر پیدا ہوا تو وہ مومن بنا دوسرا کافر کے گھر میں پیدا ہوا تو وہ کافر بنا۔ عالمِ ذر کا اس موضوع کے ساتھ کیا تعلق ہے؟

جواب الحمدللہ رب العالمین...... امابعد! ماحول و معاشرت اور گھر کا اپنا اثر واقعی ہے لیکن یہ کوئی قانونی قاعدہ نہیں ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے جیسا گھر، ویسا ہی آدمی ہوتا ہے۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرہ، آیہ ۲۵۶) یہ بھی تو ہوتا ہے جب حقائق سامنے آتے ہیں تو آثار ختم ہو جاتے ہیں۔ جب دلائل سامنے آتے ہیں تو حقائق آشکار ہو جاتے ہیں۔ جس طرح سورۂ بقرہ میں ہے: اسلام میں کوئی جبر و اکراہ والی بات نہیں تحقیق ہدایت اور ضلالت میں فرق نمایاں ہو چکا ہے۔ جب انسان حقائق کو تلاش کرتا ہے تو حقائق اپنے دلائل کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں۔ اب انسان کے اپنے اختیار کی بات ہے جس طرف آئے اور جس راہ کو اپنائے۔

بات رہی قضایا سلوک کی۔ جو بھی امر پروردگار ہے اس کے عمل کی حدود ہیں وہ اپنی حدود سے متجاوز نہیں ہوتا۔ جیسا ماحول ہوتا ہے اور کیفیات ہوتی ہیں اس اعتبار

سے انسان کا وظیفہ شرعی ہوتا ہے جیسا کہ احکام تقیہ ہیں۔ جب انسان کو خطرات لاحق ہوں تو وظائف شرعی میں تبدیلی آجاتی ہے۔ ہم نے پہلے کہا ہے ماحول و معاشرت کوئی قانون و قاعدہ نہیں ہے۔ ہم مثال کے طور پر حضرت نوحؑ کی زوجہ کا ذکر کرتے ہیں یا حضرت لوطؑ کی بیوی کا ذکر کرتے ہیں حالانکہ جس ماحول میں رہتی تھیں وہ ماحول انبیاءؑ کے گھر کا ماحول تھا لیکن وہ کافرہ رہیں۔ اِدھر فرعون کی بیوی ہے جو کفر کے ماحول میں رہتی ہے پھر بھی وہ مومنہ تھی اور ایمان کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوئی۔ البتہ وہ جو مستضعف ہیں ان کا اور حکم ہے۔ رہی بات عالمِ ذر کے ساتھ تعلق کی تو میں نہیں دیکھتا کہ اس کے لیے اس میں کوئی ظاہری تعلق ہو۔

کیا خداوند تعالیٰ نے تخلیق کا امر اپنے غیر کو سونپ رکھا ہے؟

سوال میں آپ کی ذات والاصفات سے متاثر ہوں۔ آپ اپنے تبحر علمی سے شرک و بدعت کا قلع قمع کرنے والے ہیں اور اپنے علم کے ذریعے وظیفہ شرعی کے مطابق مذہب حقہ کا دفاع کرنے والے ہیں۔ کیونکہ علم اپنے صاحب سے اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ جب بدعات ظاہر ہوں تو عالم پر واجب ہے کہ اپنے علم کو ظاہر کرے۔ اگر علم کو ظاہر نہ کرے گا تو اس پر اللہ کی لعنت ہے (الغیبۃ الطوسی، ص ۶۴۔ امالی المفید، ص ۱۳۲)۔ کیونکہ آپ ایک عالم دین ہیں اور آپ کا شمار ان علماء میں سے ہوتا ہے جو حق کے اظہار میں کسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ نہیں کرتے اور بدعات کو دفع کرتے ہیں۔ میری خداوند تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کے علوم کے صدقہ میں میرے علم میں اضافہ فرمائے اور میں اُس سے باذن اللہ مستفید ہوں۔

جناب عالی! آپ کا سایہ ہم پر ہمیشہ رہے۔
میرا سوال خلق کی تخلیق کے بارے میں ہے۔ کیا خداوند تعالیٰ خلق کی تخلیق میں کسی اور کا محتاج ہے اور اُس نے اپنے غیر کو اس امر میں مکمل طور پر دخیل کیا ہے؟ یا یوں کہیں کہ فعل اللہ کا ہوتا ہے اور ہاتھ بندے کا ہوتا ہے جس کو مجاز سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ کام تو صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ کچھ لوگ تو کہتے ہیں خداوند تعالیٰ نے یہ امر محمدؐ و آلِ محمدؑ کو سونپ دیا ہے۔ وہ اس امر میں اللہ کے وکیل ہیں۔ بغیر اس کے کہ اُس کی ذات سے خلق کی نفی نہیں کی جا سکتی۔ صاحب فعل وہی خود ہے وہ مخلوق کو پیدا کرنے والا ہے جیسے اللہ تعالیٰ ممیت ہے۔ موت دینے والا وہ خود آپ ہے۔ لیکن اُس نے موت کے فرشتے کو امر موت پر موکل فرمایا ہے اور یہ وکالت اللہ تعالیٰ سے اس کے صاحب امر ہونے کی نفی نہیں کرتی کیونکہ یہ قدرت و اختیار جو موت کے فرشتے کو ملا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے ملا ہے۔ کیا اس بات کو بنیاد بناتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندوں کو جو محمدؐ و آلِ محمدؑ ہیں، خلق کی تخلیق کا کام سونپ دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہمارا یہ عقیدہ ہو کر صاحب خلق و صاحب ارادہ تو اللہ تعالیٰ ہے لیکن یہ کام اپنے محبوب بندوں کو سونپ دیا ہے؟

جواب خداوند تعالیٰ اپنی مخلوق سے بے نیاز ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ آپ کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کلی طور پر مخلوق کی تخلیق میں اپنے غیر کو دخیل کیا ہے حالانکہ وہ خود بھی خلق کر سکتا ہے۔ یہ عقیدہ غلط ہے،

وہ خود خالق ہے اور اُس نے یہ امر کسی کو نہیں سونپا اور نہ کسی کو دخیل کیا ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے اگر اُس نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو امرِ خلق اور رزق کی اجازت دے دی ہو تو ایسا عقیدہ رکھنا جائز ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے موت کے فرشتے کو بشر کے ارواح کے قبض کرنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ اس طرح دوسرے ملائکہ اور انسانوں کو دوسرے امور میں اجازت دے رکھی ہے۔ جس طرح حضرت عیسیٰؑ کو مُردوں کو زندہ کرنے کا اذن دیا تھا۔ وہ مُردوں کو زندہ کر دیتے تھے۔ مادر زاد اندھے کو اور مبروص کو ٹھیک کر دیتے تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں حضرت عیسیٰؑ کی اس حکایت کا ذکر فرمایا ہے:

اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَکُمْ مِّنَ الطِّیْنِ کَهَیْئَةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَکُوْنُ طَیْرًاۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَ اُبْرِئُ الْاَکْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ وَ اُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ وَ اُنَبِّئُکُمْ بِمَا تَاْکُلُوْنَ وَ مَا تَدَّخِرُوْنَ فِیْ بُیُوْتِکُمْ (آل عمران، آیہ ۴۹)

"(وہ یہ کہ) میں تمہارے سامنے مٹی سے پرندے کی شکل کا مجسمہ بناتا ہوں اور اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ خدا کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے۔ اور میں اللہ کے حکم سے مادر زاد اندھے اور برص کے مریض کو تندرست اور مُردے کو زندہ کرتا ہوں اور میں تم لوگوں کو بتاتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور اپنے گھروں میں کیا جمع رکھتے ہو"۔

خداوند تعالیٰ نے قرآنِ مقدس میں حضرت عیسیٰؑ سے خطاب فرمایا:

وَ اِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّیْنِ کَهَیْئَةِ الطَّیْرِ بِاِذْنِیْ فَتَنْفُخُ فِیْهَا فَتَکُوْنُ طَیْرًاۢ بِاِذْنِیْ (سورہ مائدہ، آیہ ۱۱۰)

"جب آپ میرے حکم سے مٹی سے پرندہ بناتے تھے پھر آپ اس
میں پھونک مارتے تھے تو وہ میرے حکم سے پرندہ بن جاتا تھا"۔

آپ نے ان آیات میں غور فرمایا ہوگا کہ حضرت عیسیٰ نے خلق کی نسبت اپنی طرف دی اَنِّیْ اَخْلُقُ لَکُمْ ـــــ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے غیر کی طرف خلق کی ایک دوسرے مورد میں نسبت دی: وَ اِذْ تَخْلُقُ۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس امر کی وضاحت کے لیے فرمایا: فَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ (سورۂ مومنون، آیہ ۱۴)

موت کا فرشتہ جو ارواح کو قبض کرتا ہے وہ اللہ کے حکم سے قبض کرتا ہے۔ اس امر میں وہ ماذون ہے۔ اُسے یہ امر کلی طور پر سونپا نہیں گیا ہے کہ وہ کلی طور پر اس فعل میں مختار ہو۔

ملائکہ صرف اور صرف امور پر مامور ہوتے ہیں نہ وہ موجد امر ہوتے ہیں اور نہ صاحب امر ہوتے ہیں، جس طرح علامہ طباطبائی نے فرمایا ہے: اشیاء کے اسباب مختلف ہیں، کہیں کوئی سبب کارفرما ہے اور کہیں کوئی اور کہیں وجودی ہے، کہیں عدمی، کہیں بقا کا حکم ہے، کہیں زوال کا حکم ہے۔ احوال مختلف ہیں اور اسباب بھی مختلف ہیں۔ فرشتہ صرف اسباب کو قریب لاتا ہے تاکہ جس کام کا حکم ہوا ہے وہ ہو جائے۔ اس امر میں حکمت اور ارادہ خداوندی ہوتا ہے۔ جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف خلق کی نسبت ہے یا ان کے علاوہ کسی اور کی طرف یہ نسبت ہے۔

جس طرح موت کا فرشتہ اپنی طرف سے کسی کی موت کو واقع نہیں کرسکتا۔ اس طرح حضرت عیسیٰ بذاتِ تخلیق نہیں کرتے تھے بلکہ خداوند تعالیٰ کے حکم سے مجسمہ کو وجود عطا ہوتا تھا۔ جناب عیسیٰ کا ارادہ، ارادۂ الٰہیہ کے تابع ہوتا تھا۔

اس تمام بحث کے بعد اگر ہم کہیں کہ خداوند تعالیٰ نے محمدؐ و آلِ محمدؑ کو خلق کا امر تفویض فرمایا ہے تو ہمیں اپنے اس دعویٰ کے لیے قاطع دلیل چاہیے اور وہ دلیل

ہمارے پاس نہیں ہے۔

بعد از حضرت عیسٰیؑ حجتِ خدا

سوال روایات میں موجود ہے اگر زمین ایک لمحہ کے لیے حجتِ خدا سے خالی ہو جائے تو اپنے اہل سمیت دھنس جائے۔ حالانکہ حضرت عیسٰیؑ کے بعد حضرت رسول اکرمؐ تک کوئی رسول اور نبی نہیں تھا اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب ہم آپ کے سوال کے جواب میں قرآنِ کریم کی آیت پیش کرتے ہیں۔ خداوند تعالیٰ نے کفار سے خطاب فرمایا:

كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ○ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ (سورۂ ملک، آیہ ۸-۹۔ تفسیر المیزان، ج ۲۰/۱۸۱-۱۸۲)

"جب بھی اس میں کوئی گروہ ڈالا جائے گا اُس سے جہنم کے کارندے پوچھیں گے کیا تمہارے پاس کوئی تنبیہ کرنے والا نہیں آیا؟ تو وہ جواب دیں گے ہاں تنبیہ کرنے والا ہمارے پاس آیا تھا تو ہم نے اُسے جھٹلا دیا تھا اور ہم نے کہا: اللہ نے کچھ بھی نازل نہیں کیا"۔

خداوند تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (سورۂ فاطر، آیہ ۲۴)

"اور کوئی اُمت ایسی نہیں گزری جس میں کوئی متنبہ کرنے والا نہ آیا ہو"۔

① اس عنوان کے تحت بہت سی روایات ہیں جو اس امر پر دال ہیں کہ حضرت

عیسیٰؑ اور رسولِ آخر و اعظمؐ کے درمیانی زمانہ میں کتنے اوصیاء، انبیاء اور علماء گزرے جو سب اللہ کی طرف سے اس کی زمین پر حجت تھے۔ بعض کے اسماء کا تذکرہ موجود ہے جو عنقریب آپ کے سامنے واضح ہو جائے گا۔

المختصر کچھ نمائندگان الٰہی مخفی رہے جس طرح حضرت ابوطالبؑ تھے۔ آپ وصی تھے لیکن آپ کا اسم گرامی ظاہر و باہر نہیں آیا۔ یا کچھ نمائندگان وہ تھے جو لوگوں کی نظروں سے غائب رہے جن پر روایات دال ہیں۔ یہ دنیا اپنے ہر دور میں حجت سے خالی نہیں رہی۔ ہر دور میں حجج الٰہیہ مقرر ہوتے رہے۔ وہ تعداد میں کثیر تھے۔ تاریخ نے ان ذواتِ مقدسہ کو عوام الناس سے علیحدہ کر کے ہمیں نہیں دکھایا اور نہ ان کے اسماء کی تصریح کی۔

② روایات میں آیا ہے زمین حجتِ خدا سے کبھی خالی نہیں رہی۔ وہ حجتِ خدا یا تو ظاہر اور مشہور رہی یا غائب و مستور رہی (نہج البلاغہ، ص ۴۹۷، نمبر ۱۴۷۔ الارشاد، ج ۱، ص ۲۲۸، خصال، ص ۱۸۶)۔ اس موضوع پر کثرت کے ساتھ احادیث وارد ہوئی ہیں مصادر کی طرف رجوع فرمائیں۔ (بصائر الدرجات، ص ۵۰۳ سے ۵۰۹ تک۔ الکافی، ج ۱، ص ۱۷۷ تا ۱۸۰ وغیرہ وغیرہ)

نہج البلاغہ میں امام علی علیہ السلام کا فرمان ہے، آپؑ فرماتے ہیں:

لَمْ يُخْلِ اللّٰهُ سُبْحَانَهُ خَلْقَهُ مِنْ نَبِيٍّ مُرْسَلٍ اَوْ كِتَابٍ مُنْزَلٍ اَوْ حُجَّةٍ لَازِمَةٍ اَوْ حُجَّةٍ قَائِمَةٍ رُسُلٌ لَا تُقَصِّرُ بِهِمْ قِلَّةُ عَدَدِهِمْ وَلَا كَثْرَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ لَهُمْ مِنْ سَابِقٍ سُمِّيَ لَهُ مَنْ بَعْدَهُ اَوْ غَابِرٍ عَرَّفَهُ مَنْ قَبْلَهُ عَلٰى ذٰلِكَ نَسَلَتِ الْقُرُوْنُ ، وَمَضَتِ الدُّهُوْرُ وَسَلَفَتِ الْآبَاءُ وَخَلَفَتِ الْاَبْنَاءُ ، اِلٰى اَنْ بَعَثَ اللّٰهُ نَبِيَّهُ مُحَمَّدًا

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی مخلوق کو بغیر کسی فرستادہ پیغمبر یا آسمانی کتاب یا دلیل قطعی یا طریق روشن کے کبھی نہیں چھوڑا۔ ایسے رسول جنھیں تعداد کی کمی اور جھٹلانے والوں کی کثرت درماندہ اور عاجز نہیں کرتی تھی ان میں کوئی سابق تھا جس نے بعد میں آنے والے کا نام ونشان بتایا۔ کوئی بعد میں آیا جسے پہلا پہنچوا چکا تھا۔ اس طرح مدتیں گزر گئیں، زمانے بیت گئے۔ باپ داداؤں کی جگہ پر ان کی اولادیں بس گئیں یہاں تک اللہ تعالیٰ نے ایفائے عہد اور اتمام حجت کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا"۔

③ روایات میں انبیاءؑ کا ذکر ہے جنھیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے مبعوث کیا گیا۔ ان میں سے ایک کا اسم گرامی خالد بن سنان ہے، جنھیں حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پچاس سال قبل مبعوث کیا گیا تھا۔

④ اکمال الدین واتمام النعمۃ میں ایک حدیث موجود ہے جس میں انبیاء علیہم السلام کا ذکر موجود ہے۔ پہلے جناب عیسیٰؑ کا تذکرہ ہے، ان کے بعد جناب یحییٰؑ پھر جناب عزیرؑ پھر جناب دانیالؑ کا تذکرہ ہے۔ جناب عیسیٰؑ اور جناب پیغمبر آخرؐ کے درمیان جو زمانہ فترت ہے یہ تمام انبیاءؑ اس دور میں آئے اور یہ زمانہ چار سو اسی سال پر محیط ہے۔ یہ سب اولیاء اللہ تھے اور اس کی زمین پر اُس کے نمائندے تھے اور یہ انشو ابن ملکیتا کی اولاد میں سے تھے جو اس ولایت و وصایت کے یکے بعد دیگرے وارث بنتے چلے آئے جب تک خداوند تعالیٰ نے چاہا۔ (تفسیر نور الثقلین، ج ۱، ص ۷۰۳ واکمال الدین واکمال النعمۃ، ص ۲۶۶ و بحار الانوار، ج ۱۴، ص ۵۱۸)

⑤ ایک اور حدیث جو طولانی ہے جس کے آخر میں یہ الفاظ ہیں: آپؐ نے

فرمایا: حضرت عیسیٰؑ نے حضرت شمعونؑ کو اپنا وصی بنایا۔ حضرت شمعون بن حمون الصفا نے جناب یحییٰؑ بن زکریا کو اپنا وصی بنایا۔ جناب یحییٰؑ نے جناب منذر کو وصی بنایا، جناب منذر نے جناب سلیمہ کو وصی بنایا۔ جناب سلیمہ نے جناب بردہ کو وصایت عطا کی۔ پھر رسول اکرمؐ نے فرمایا: جناب بردہ نے وہ وصایت مجھے عنایت کی اور وہ میں نے اے علیؑ! تمہیں عطا کی۔ (نور الثقلین، ج۱ص ۶۰۳-۶۰۴ و بحار، ص ۳۳۵-۳۳۶، جلد ۱۷، ص ۱۴۸، جلد ۲۳، ص ۵۸، والامامت والتبصرہ، ص ۲۳ وامالی الصدوق، ص ۴۸۸، اکمال الدین، ص ۲۱۳، امالی الطوسی، ص ۴۴۳)

جناب یحییٰؑ کا مزید ذکر آئے گا۔ اس امر میں راوی کو اشتباہ نہیں ہوا ہے۔ یہ جاری ہے اور روایت کے موافق ہے۔ جس کو مسعودی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت یحییٰؑ حضرت عیسیٰؑ کے بعد مبعوث ہوئے۔ (قرآن مجید کے مطابق حضرت یحییٰؑ حضرت عیسیٰؑ سے پہلے آئے، مترجم)

اور جناب شیخ صدوق نے بھی اکمال الدین میں یہی روایت کی ہے جس کا نمبر۴ میں ذکر ہو چکا ہے۔

⑥ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مجوسیوں کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؑ نے فرمایا: کوئی بھی ایسی اُمت نہیں آئی مگر ان کی طرف نذیر بھیجا گیا۔ ان کی طرف بھی نبی بھیجا گیا تھا، اس کے پاس کتاب بھی تھی لیکن انھوں نے اپنے نبی کا انکار کیا۔ (نور الثقلین، ص ۳۵۹، الاحتجاج و بحار الانوار، ج۱، ص ۱۷۹، ج ۱۴، ص ۴۶۲)

⑦ ایک دوسری نص ہے: حضرت عیسیٰؑ نے حضرت شمعون بن حمونؑ کو اپنا وصی بنایا جب حضرت شمعون اس دنیا سے چلے تو یہ حجج اللہ غائب ہو گئے۔ ان کی ضرورت نے شدت اختیار کی اور مصائب کی کوہ گرانیاں بڑھ گئیں۔ (بحار، ج ۱۴، ص ۳۴۶-۳۴۷، کمال الدین، ص ۱۶۰)

حجتوں کے غیب ہونے کا معنی یہ نہیں کہ وہ زمین پر موجود ہی نہیں تھے۔ موجود تھے لیکن ظالموں اور جباروں کی آنکھوں سے پوشیدہ تھے۔ اس امر کی وضاحت درج ذیل روایت سے ہوتی ہے۔

⑧ ایک اور روایت جو حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے جاری ہوئی۔ آپؑ نے فرمایا: حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ ہے۔ اسی فاصلے میں اڑھائی سو سال کے عرصے میں کوئی عالم ظاہراً موجود نہیں تھا۔

راوی کہتا ہے: میں نے سوال کیا: وہ کس دین پر تھے؟

آپؑ نے فرمایا: وہ سب دین عیسیٰؑ پر تھے۔

میں نے پوچھا: دین کی حیثیت سے وہ کیا تھے؟

آپؑ نے فرمایا: وہ سب مومن تھے۔

پھر آپؑ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی زمین میں ہمیشہ ہر دور میں اللہ کی طرف سے حجت رہی ہے۔ زمین حجت کے بغیر نہیں رہی۔ (بحار، ج ۱۴، ص ۳۴۷-۳۴۸، کمال الدین، ص ۱۶۱ و تفسیر نور الثقلین، ج ۵، ص ۳۱۴)

⑨ مسعودی نے اپنی کتاب "اثبات الوصیت" میں جناب عیسیٰؑ کے حالات میں لکھا ہے: آپ نے جناب شمعون کو اپنا وصی بنایا اور اسم اعظم اور تابوت الٰہی کے حوالے کیا۔ جناب شمعون کے بعد جناب یحییٰؑ کا ذکر کیا۔ ان کے بعد جناب دانیال کا ذکر کیا۔ اس ذکر کے بعد کہا ایک روایت میں ہے کہ جناب عزیر اور جناب دانیال جناب مسیحؑ سے اور جناب یحییٰؑ بن زکریاؑ سے قبل تھے۔

⑩ یہاں ہم یہ کہیں گے انھی روایات میں جناب ابوطالبؑ کی طرف اشارہ ہے کہ آپ بھی انھی الٰہی وصیوں میں سے ایک وصی تھے۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ

جب جناب امیرالمومنین علی علیہ السلام سے پوچھا گیا: نبی اکرمؐ سے قبل آخری وصی کون تھے؟ آپؑ نے فرمایا: میرے والد۔ (الغدیر، ج ۷، ص ۳۸۹)

⑪ درست بن ابی منصور سے روایت ہے انھوں نے امام کاظم علیہ السلام سے پوچھا گیا: کیا حضرت ابوطالب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے حجت تھے؟ آپؑ نے فرمایا: نہیں بلکہ ان کا وظیفہ تھا کہ وصایا ان کے سپرد کریں اور انھوں نے پیغمبر اکرمؐ کے حضور وصایا پیش کر دیں۔

راوی کہتا ہے: میں نے عرض کیا: کیا انھوں نے وصیتیں اس لیے پیش کیں کہ رسولؐ اللہ ان کے لیے حجت تھے؟ آپؑ نے فرمایا: اگر وہ خود ان پر حجت ہوتے تو پھر وصایا ان کے حوالے نہ کرتے۔

پھر میں نے سوال کیا: جناب ابوطالبؑ کے بارے میں آپ کیا فرمائیں گے؟ آپؑ نے فرمایا: جناب ابوطالبؑ نے نبی کی نبوت کا اقرار کیا تھا اور جو کچھ پیغمبرؐ لائے تھے اس پر ایمان لائے تھے۔ وصیت ان کے حوالے کی اور ان کی زندگی میں وفات پا گئے۔ (الکافی، ج ۱، ص ۴۴۵۔ الغدیر، ج ۷، ص ۳۸۹)

جب جناب ابوطالبؑ وصی تھے تو جناب عبدالمطلب کے بارے میں یہی کہا گیا ہے: جب قیامت کا دن ہوگا اور وہ عرصۂ محشر میں آئیں گے تو ان کے چہرے پر بادشاہوں کی ہیبت ہوگی اور انبیاءؑ کی علامات رکھتے ہوں گے۔

⑫ شیخ صدوقؒ نے کتاب فترت میں فرمایا ہے۔ اگرچہ اس زمانۂ فترت میں ظاہری طور پر نہ کوئی نبی ہے نہ وصی جیسا کہ پہلے انبیاءؑ کا سلسلہ تھا۔ اسی امر کی شہادت قرآن کریم میں بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انبیاء و اوصیاء کے فترت کے زمانے میں مبعوث فرمایا لیکن حضرت عیسیٰؑ اور پیغمبر آخرؐ کے درمیان بہت سے انبیاءؑ اور آئمہ آئے لیکن اُن سب نے اپنے آپ کو حکمِ خداوندی کے مطابق

چھپائے رکھا کیونکہ انھیں جبار بادشاہوں کا خوف دامن گیر تھا۔ انھی میں سے ایک خالد بن سنانی عنبسی تھے جو نبی ان کی قوم نے ضائع کر دیا ان کے بارے میں خاص و عام سے متواتر احادیث موجود ہیں۔ ان کی بعثت اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے درمیان پچاس سال کا فاصلہ ہے۔ (نور الثقلین، ج ۱، ص ۶۰۴ و کمال الدین، ص ۶۵۹ و تفسیر صافی، ج ۲، ص ۴۴)

آخر میں ہم یہی کہیں گے اگرچہ حضرت عیسیٰؑ اور ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا درمیانی زمانہ، زمانۂ فترت ہے یعنی اس زمانے میں رسول مبعوث نہیں ہوئے لیکن انبیاءؑ اور اوصیاءؑ حاضر یا غیب صورت میں موجود رہے۔ جس طرح اس زمانے کے امور کا تقاضا تھا۔ اس مناسبت سے یہ حضرات اس صورت میں موجود رہے بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ فترت سے مراد فترت غیبہ ہے۔ اس زمانے میں اوصیاء فتنہ و فساد اور انحراف کا مقابلہ کرتے تھے۔

اس عنوان کے تحت کثرت کے ساتھ روایات موجود ہیں۔ ان روایات کو شیعہ اور سنّی سب نے روایت کیا ہے۔ موضوع کافی طویل ہے۔ ہم اپنے اسی مضمون پر اکتفا کرتے ہیں۔

حضرت جبرئیل امینؑ اور حضرت محمد رسولؐ اللہ کا علم

سوال حضرت جبرئیلؑ قرآن کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر لاتے تھے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ وحی ربانی جو رسولؐ اللہ کی طرف اللہ تعالیٰ ارسال فرماتا تھا تو اس وحی کا علم رسولؐ اللہ سے قبل جناب جبرئیلؑ تک پہنچ جاتا تھا۔ اس لحاظ سے علمی سبقت جناب جبرئیلؑ کو حاصل ہوگئی۔ اس کے علاوہ کیا جناب جبرئیلؑ کا علم اور رسولؐ اللہ کا علم مساوی تھا۔ ان اُمور کے

بارے میں آپ کیا فرمائیں گے؟

جواب الحمدللہ! اولاً تو ہم یہ کہیں گے یہ امر بدیہی ہے۔ آپ کے سامنے ہزاروں لوگ قرآن کریم پڑھتے ہیں لیکن قرآن کریم سے استفادہ کے اعتبار سے ہر آدمی دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ ہر انسان کے استفادہ کا زاویہ مختلف ہے۔ یہ بات تو ٹھیک ہے حضرت جبرئیلؑ حاملِ قرآن تھے۔ وہ قرآن پیغمبرؐ کے پاس لاتے تھے تو ہم اس امر سے یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ قرآن کے معانی و مطالب اور اشارات و دلائل میں جبرئیلؑ رسولؐ اللہ سے اَعلم تھے۔ ہم یہ کہیں گے جو نگاہ قرآنِ کریم پر رسولؐ اللہ کی تھی وہ نگاہ جنابِ جبرئیلؑ کے پاس نہ تھی۔

دوسری بات یہ ہے کہ قرآن مجید کے معانی قلبِ رسولؐ پر پہلے نازل ہو چکے تھے۔ شاید یہ کہ وحی العالی کے طریقہ سے یا اس کے علاوہ کسی اور طریقہ وحی سے نازل ہو چکے تھے۔ جنابِ جبرئیلؑ کی حیثیت قرآنِ مجید کے معاملے میں صرف توسل کی تھی وہ خداوند تعالیٰ سے لیتے اور پیغمبرؐ تک پہنچا دیتے۔ شاید یہ بھی ہو کہ جنابِ جبرئیلؑ کی وساطت نزولِ تدریجی میں ہو کیونکہ ایک دفعہ تو سارا قرآن پیغمبرؐ کے قلب پر بھیج دیا گیا تھا۔ پھر احکام اور ضرورت کے مطابق جنابِ جبرئیلؑ قرآن کے ساتھ پیغمبرؐ کے پاس آتے رہے۔ ہمارے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جس کی بنیاد پر ہم کہہ سکیں کہ جنابِ جبرئیلؑ کو رسولؐ اللہ سے قبل قرآن کا القاء ہو جاتا تھا۔

تیسری بات جنابِ جبرئیلؑ کی عظمت اس حوالے سے ہے کہ وہ جنابِ خاتمؐ کے لیے وحی کے حامل تھے۔ ان کی ذات کے لیے ایک بہت بڑا شرف، فخر اور مجد ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ رسولؐ اللہ کے مقام و مرتبہ اور منزلت کے عارف تھے اور وہ ان کے لیے بطور شاہد بھی تھے۔

❋......❋......❋

دوسرا حصّہ

قرآنیات

قرآن معجزہ خالدہ

سوال حضرت عیسیٰؑ کا معجزہ کوئی باقی نہ رہا جس طرح حضرت محمدؐ کا معجزہ ہمیشہ کے لیے باقی ہے؟

جس طرح قرآنِ کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے معجزہ ہے اس طرح جناب موسیٰؑ کے لیے توارات اور جناب عیسیٰؑ کے لیے انجیل معجزہ کیوں نہ رہے؟

بعض پادری کہتے ہیں: مسلمان "مسیح اور مسیحیت" کا اعتراف کرتے ہیں۔ ان کا اعتراف یہ دلیل ہے۔ دینِ مسیحی حق و حقیقت ہے لیکن عیسائی اسلام کا اعتراف نہیں کرتے تو اس اعتبار سے اسلام کے پاس صرف دعویٰ ہے اور دعویٰ کے ثبوت کی دلیل نہیں ہے۔ اگر عیسائی اسلام کے کسی امر کا اعتراف کرتے تو اُسے تسلیم بھی کرتے؟

جواب الحمدللہ! ہمیں اس امر کا اعتراف ہے۔ ہمارے لیے یہ ناممکن ہے کہ ہم کلی امور کی حقیقت اور اُن کے اسباب کے عارف ہوسکیں۔ ہم جناب موسیٰؑ اور جناب عیسیٰؑ کے معجزات کے اسباب کے بارے میں نہیں جانتے کہ ان کے معجزات کیوں ختم ہوگئے، ہمیشہ کے لیے باقی کیوں نہ رہے، توارات اور انجیل معجزہ نہ رہے۔

اگر جناب عیسیٰؑ کا معجزہ تھا تو وہ انجیل تھی۔ جناب موسیٰؑ کا معجزہ تورات تھی۔ اگر وہ ابدی معجزے ہوتے تو پھر اسلام کی ضرورت ہی نہ تھی اور پیغمبرؐ کے معجزہ کی بھی حاجت نہ ہوتی۔

لیکن حقیقت یہ ہے جس کا انکار کرنا مشکل ہے۔ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت موسیٰؑ کے معجزات ان کے اپنے زمانے سے پیدا ہوئے اور پھر اپنے وقت میں ختم ہو گئے۔ پھر ان کے علم کا انحصار صرف روایت پر رہا۔ جب کسی چیز کا دارومدار صرف نقل و روایات پر ہو تو نقل و روایات شک و تردید سے کبھی محفوظ نہیں رہے ہیں۔

نقل و روایات میں صدق و کذب دونوں کا احتمال ہوتا ہے، چاہے وہ اشخاص کی بات ہو یا وسائل اثبات کی بات ہو۔

اس بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ دینِ موسیٰؑ اور دینِ عیسیٰؑ کے پیروکاران اپنے دین کی سچائی کے ثبوت میں یہ دلیل دیتے ہیں کہ اسلام نے ان کے ادیان کا اعتراف کیا ہے۔ یہ اعتراف دلیل ہے کہ ان کا دین سچا ہے حالانکہ ان کے ادیان روایات سے ثابت ہیں لیکن دینِ اسلام کا اعجاز حاضر ہے، موجود ہے۔ وہ روایات کا محتاج نہیں ہے بلکہ وہ ادراک سے ثابت ہے۔ اس کے براہین اللہ کی طرف سے نازل ہوئے ہیں۔ جب دینِ اسلام اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے تو سچا ہے۔ جب اس کی سچائی ثابت ہو گئی ہے تو ضروری ہو گیا ہے کہ اسی دین کو قبول کیا جائے اور اس کے مقابلے میں باقی ادیان کو رد کیا جائے۔

پس اس اعتبار سے یہودیت اور مسیحیت کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ دینِ اسلام کو قبول کریں کیونکہ وہ اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے میں عاجز ہیں اس لیے کہ اسلام ایسا معجزہ ہے جو حاضر ہے اور اسلام کا معجزہ قرآن کریم ہے۔ جو ہر زمانے میں ثابت رہا ہے اور رہے گا۔ پس ہر شخص کے لیے ضروری ہے وہ اس میں غور و خوض کرے

اور اس کے اعجاز کو درک کرے۔ قرآن فہمی کے لیے عربی زبان کا سیکھنا ضروری ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کا مادر زاد اندھے کو بینائی دینا اور مُردوں کو زندہ کرنا معجزہ تھا۔ حضرت موسیٰؑ کا عصا اور دریا کا پھاڑنا بھی معجزہ تھا۔ ان کے بارے میں قرآن نے وضاحت فرمائی ہے لیکن ان معجزات کے علاوہ باقی جو کچھ بھی عیسائی اور یہودی دنیائے عالم کو پیش کرتے ہیں وہ صرف اور صرف نقل و روایت ہے۔ نقل و روایت میں صدق و کذب دونوں کا احتمال موجود ہے۔ لیکن قرآن معجزہ ہے اور ثابت ہے کہ اللہ کا کلام ہے کیونکہ وہ علام الغیوب کی طرف سے ہے۔

تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ اسلام اپنے آپ کو ثابت کرتا ہے۔ نہ یہودیت کا محتاج ہے اور نہ عیسائیت کا محتاج ہے لیکن یہودیت اور مسیحیت اپنے آپ کو ثابت کرتے ہیں کہ بری طرح سے عاجز ہیں۔

باقی رہی بات یہ کہ ان دونوں کا دعویٰ ہے کہ اسلام اُن کا اعتراف کرتا ہے کیونکہ اسلام ایک دین الٰہی ہے جو دلیل کے ساتھ ثابت ہے اور اپنے ماقبل کی خبر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ یہودیت اور مسیحیت اپنے آپ کو صرف اتنا ثابت کرسکتے ہیں جتنا کچھ قرآن اور اسلام نے ان کے بارے میں ثابت کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس کچھ بھی نہیں۔

حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے معجزات کے خلود کو کوئی بھی تسلیم نہیں کرتا۔ ان کے معجزات محدود مدت تک تھے۔ آج باقی نہیں ہیں لیکن ان کے مقابلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معجزہ جب سے ہے باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا۔

اَرَدتُّ، اَرَدنَا، اَرادَ اللہ

سوال قرآن کریم میں حضرت موسیٰؑ اور عبد صالح کے درمیان ایک واقعہ موجود ہے۔ قرآن کریم نے عبد صالح کی گفتگو کو تین

مختلف صورتوں میں پیش کیا۔

جب سفینہ میں سوراخ کا حادثہ ہوا تو اس بارے میں عبد صالح نے فرمایا: فَأَرَدْتُّ أَنْ أَعِيبَهَا (الکہف:۷۹)۔ جب ایک بچے کو قتل کیا تو فرمایا: فَأَرَدْنَا أَنْ يُبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ (الکہف:۸۱)۔ جب دیوار اور خزانے پر بات ہوئی تو انھوں نے فرمایا: فَأَرَادَ رَبُّكَ أَنْ يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنزَهُمَا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي (الکہف:۸۲)۔ ان مختلف تعبیرات کے بارے میں آپ کیا فرمائیں گے۔ ہر ننے امر کے لیے مختلف صیغے استعمال کیے گئے ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

جواب امابعد! ان تعبیرات کی تنویع کا سبب "الماح"[۱] ہے۔

① جب جناب خضرؑ نے سفینہ میں سوراخ کیا تو یہ ان کا ذاتی فعل تھا کیونکہ آپ جانتے تھے کہ اس تکلیف کے ساتھ یہ مساکین لوگ ظالم کے ظلم سے محفوظ ہو جائیں گے۔ اگر آپ ایسا نہ کرتے تو یہ بہت سے لوگوں کا نقصان ہوتا جب کہ حضرت خضرؑ بھی انھیں لوگوں میں سے تھے۔ آپ کا بھی نقصان ہوتا اس طریقے سے آپ نے سفینہ کے مالکوں کو اور دوسرے متعلقہ لوگوں کو اور اپنی ذات کو بھی نقصان سے بچا لیا۔ آپ نے ایک ایسا طریقہ اختیار کیا جس سے آپ کا وظیفہ شرعی پورا ہو گیا۔ اُس وقت وہ اپنے آپ کو معاشرے کا ایک فرد خیال کر رہے تھے۔ نہ ایسا نبی جو حاکم ہو کہ اپنے حکم اور طاقت سے نقصان نہ ہونے دے۔ ایسی مثالیں قرآن و احادیث میں موجود ہیں جیسے فرمانِ خداوندی ہے:

① الماح: استعارہ وتشبیہ کی قسم ہے۔ کلام میں کسی کہاوت، قصہ، شعر کی طرف اشارہ کرنا تلمیح کہلاتا ہے۔ مترجم

إِذَا حُيِّيْتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا (سورۂ نساء، آیہ ۸۶)

"جب تمھیں سلام کیا جائے تو تم اُس سے بہتر سلام کرو یا انھی الفاظ سے جواب دو"۔

تحیات انسانی اختراع ہے اور تحیات کا رد بھی انسانی اختراع ہے۔ اسی طرح آئمہ معصومینؑ کے فرامین میں سے ہے: أحیوا امرنا، "ہمارے امر کو زندہ کرو"۔ یہ امر عام ہے۔ اب اس امر کے مصادیق کو ہم نے ایجاد کرنا ہے۔ اب اس امر کی زندگی کے لیے اشعار کا سہارا لیں، تبلیغ و ترویج کریں، تبلیغ و ترویج تحریری ہو یا تقریری یا جدید ٹکنالوجی کے ذریعے ہو۔ ہم پر واجب ہے کہ اہل بیتؑ کے امر کو زندہ رکھیں چاہے وہ جس طریقے سے بھی ہو۔ یہی حال جناب خضرؑ کا تھا۔ اُنھوں نے اپنے وظیفہ کے مطابق کام کیا۔ جو اُن کا وظیفہ جس کیفیت و طریقے سے بنتا تھا۔

② جناب خضر علیہ السلام نے بچے کے قتل پر فرمایا: فَأَرَدْنَا أَن يُبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ (الکہف:۸۱) "پس ہم نے چاہا کہ ان کا رب انھیں اس کے بدلے ایسا فرزند دے جو پاکیزگی میں اس سے بہتر ہو"۔

جناب خضرؑ کی یہ گفتگو دو پہلو رکھتی ہے: ایک پہلو ہے اللہ کا رابطہ۔ اللہ تعالیٰ نے والدین کے حقوق مقرر فرمائے ہیں اور جو شخص اپنے والدین پر ظلم کرے اور انھیں کفر و سرکشی میں مبتلا کر دے جو ان کی طاقت سے باہر ہو تو ایسی اولاد کی حدود بھی مقرر فرما دی ہیں۔ فرمایا: فَخَشِينَا أَن يُرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَكُفْرًا (الکہف:۸۰) "پس ہمیں یہ ڈر لگا کہیں وہ ان دونوں کو سرکشی اور کفر میں مبتلا نہ کر دے"۔

ایسے اوصاف کے حامل انسان کی سزا قتل ہے۔ جب وہ اپنے والدین کے حق میں ظالم ہو اور انھیں ظلم و کفر و سرکشی سے دوچار کرنے والا ہو۔ یہ حکم قتل اللہ تعالیٰ کی

طرف سے صادر ہوا تھا۔ اس میں کوئی شک وشبہ کی بات ہی نہیں۔ یہ کارخداوندی تھا نہ کہ جناب خضرؑ کا فعل تھا اور یہ امر ہر اُس انسان کے لیے ہے جو ان مذکورہ صفات کا حامل ہو۔

دوسرا پہلو یہ ہے۔ یہ امر جناب خضرؑ سے مربوط بھی ہے کیونکہ وہ اس حکم پر مکلف تھے اور انھیں اس موقع پر وہ ولایت وحاکیت حاصل تھی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے صادر ہوگئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس بچے کے کفر وطغیان پر انھیں مطلع کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بچے کے متعلق اپنے ارادہ کی بھی وضاحت کر دی تھی کیونکہ جناب خضرؑ حکمِ الٰہی کے اجراء پر مصدی تھے، اس لیے یہ قتل فعلِ پروردگار تھا۔ اس میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں ہے۔

② جناب خضر علیہ السلام نے دیوار بناتے وقت فرمایا: فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَ يَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا (الکہف:۸۲) ''آپ کے رب نے چاہا کہ یہ دونوں اپنی جوانی کو پہنچ جائیں اور آپ کے رب کی رحمت سے اپنا خزانہ نکالیں''۔

یہاں آپ نے اس دیوار کے معاملے میں اللہ کی طرف ارادہ کی نسبت دی کیونکہ خداوند تعالیٰ نے انھیں اس خزانہ کی خبر دی تھی اور اس خزانہ کی اطلاع یا خبر ایک لوح پر لکھی ہوئی تھی۔ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھی جس میں موت وقدر کے مسائل بھی مکتوب تھے۔ خداوند تعالیٰ نے ارادہ فرمایا تھا کہ ظالموں کے شہر میں ان دو یتیموں کی حفاظت کا پروگرام ہوجائے کیونکہ اس شہر کے لوگ فاسق وفاجر تھے۔ جب ان لوگوں سے دونبیوں نے یعنی حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ نے کھانے کا سوال کیا تھا تو اُنھوں نے کھانا دینے سے انکار کر دیا تھا تو کیا ایسے لوگوں پر توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ یتیموں کا خیال رکھیں گے اور ان کے بعد ان کے مال کی حفاظت کریں گے۔ حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے مرحوم والد کے صالح ہونے کی وجہ سے رعایت رکھتے

تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک ولی کو حکم دیا کہ دیوار بنا کر ان کے خزانے کو محفوظ کر دیں۔ اس مقام پر اللہ کا ارادہ تھا کہ ان یتیموں کے مال کی حفاظت ہو جائے۔

اس لیے اُس ذات نے اپنے ارادہ کے اجراء کے لیے جناب خضرؑ کو حکم فرمایا۔ اس واقعہ کے تمام اُمور کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے کہ اُس ذات نے اپنے نبی کو خزانہ کی اطلاع دی۔ ان بچوں اور ان کے صالح والد کے بارے میں بھی باخبر فرمایا۔ تمام حفاظتی پروگرام کی بھی اپنی طرف نسبت دی۔ آخر میں جناب خضر علیہ السلام نے ان الفاظ میں تصریح فرما دی۔ فرمایا: وَ مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ (الکہف:۸۲) ''اور یہ میں نے اپنی جانب سے نہیں کیا''۔ والحمدللہ رب العالمین!

اَفَرَاَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ

سوال اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: اَفَرَاَیْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ○ ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ○ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ○ (الواقعہ، آیہ ۶۳-۶۵)

آگے فرمایا: اَفَرَاَیْتُمُ الْمَآءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ ○ ءَ اَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ○ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ○ (الواقعہ، آیہ ۶۸-۷۰)

پہلی آیت میں ''لَجَعَلْنٰهُ'' لام کے اثبات کے ساتھ اور دوسری آیت میں ''جَعَلْنٰهُ'' لام کے حذف کے ساتھ فرمایا ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟

جواب یہ درج بالا پہلی آیات کھیتی باڑی کے بارے میں ہیں اور حصول زراعت کے بارے میں ہیں۔ خداوند تعالیٰ کا قول ہے: لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا ''اگر ہم چاہیں تو اُسے ریزہ ریزہ کر دیں''۔

یعنی اگر ہم چاہیں تو ان تمام عناصر کو ختم کر کے رکھ دیں اور اُس کے تمام نتائج کو ہلاک کر ڈالیں جو اُس سے متحقق ہوں یا اُس سے نشوونما پاتے ہوں۔

لَجَعَلْنٰهُ پر جو لام ہے اس کے بارے میں کہا گیا ہے یہ حرف کھیتی کی دو حالتوں کے اتصال کے لیے آیا ہے کیونکہ کھیتی کی دو صورتیں بیان ہوئی ہیں۔ ایک وقت میں کھیتی موجود ہے اور دوسرے وقت میں موجود نہیں ہے۔ وہ ویران ہوگئی ہے اس تبدل و انتقال کی تاکید کے لیے آیا ہے جو رونما ہو چکا ہے کہ پہلے کچھ حالت تھی اب کچھ ہوگئی ہے۔

یہ "لام" پہلی حالت اور دوسری تباہی و ویرانی والی حالت کے درمیان رابطہ قائم کیے ہوئے ہے کہ پہلے کھیتی باڑی تھی پھر قدرت کی سزا کی وجہ سے برباد ہو کر رہ گئی۔ زراعت ایک حالت سے دوسری حالت میں بدل گئی۔ اس بات کی وضاحت ہو رہی ہے۔ خداوند تعالیٰ اگر چاہے تو طبیعت کے تمام طریقوں کو ہلاک کر کے رکھ دے۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ یہ انسان کو سمجھایا جا رہا ہے کہ خداوند تعالیٰ سب کچھ کر سکتا ہے۔ کیونکہ انسانی طبیعت آسانی کے ساتھ کسی چیز کو قبول کرنے والی نہیں اس لیے بات کو مؤکد کر کے پیش کیا گیا ہے۔

دوسری آیت مقدسہ میں پانی کا ذکر ہے۔ وہاں جَعَلْنٰهُ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، یہاں لام نہیں ہے۔ آیتِ مقدسہ کا معنی ہے: "اگر ہم اُسے چاہیں تو کھارا بنا دیں"۔ تو اس سے مراد یہ ہے کہ کائنات کے پہلے دن سے ہم چاہتے تو پانی کو کھارا بنا دیتے۔ یعنی نقطۂ ایجاد سے پانی کڑوا ہوتا۔ اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ اب جو پانی تم پی رہے ہو، استعمال کر رہے ہو اس کو کڑوا بنا دیں۔ اس سے مٹھاس کو چھین لیں اور کھارے پن میں بدل لیں۔

یہاں پانی کی حالت بدلنے کی بات نہیں ہے بلکہ پانی کی ایجاد کی بات ہے۔ یہاں تاکید کی بات نہ تھی اس لیے صرف جَعَلْنٰهُ کہا گیا ہے۔ لام تاکید نہیں لایا گیا۔

کیونکہ سب کچھ اُسی کے اختیار میں ہے۔ وہ اپنی مخلوق کے طبائع و حالات وصفات کو خوب جانتا ہے۔ اس کے اشارے پر ہی کائنات چل رہی ہے۔ اس کے سوا تو کچھ بھی نہیں۔

پہلے سوال کے جواب میں ہم یہ کہیں گے۔ انسان یہ سمجھتا ہے کہ زراعت کی اساس اُسی کے پاس ہے۔ وہ خود کھیتی باڑی کرتا ہے۔ اس کے اسباب مہیا کرتا ہے۔ اب جو نتائج برآمد ہوں اور حصولِ زرع ہو تو اُسی کا ہو اور اُس کے اختیار میں ہو۔ اُس کی محنت پر کسی اور کو اختیار نہ ہو۔ اسی امر کو سمجھانے کے لیے خداوند تعالیٰ نے تاکیداً فرمایا کہ جو تم اپنے اختیارات خیال کرتے ہو وہ تمہارے پاس نہیں ہیں۔ وہ جب چاہے مداخلت کر کے تمہارے تمام اُمور کو باطل کر سکتا ہے۔

دوسرا مورد پہلے مورد سے مختلف ہے۔ پانی کا بادل سے اُتارنا انسانی دائرۂ اختیار سے خارج ہے۔ یہ بادل کا نظام ہر صورت میں اسی قادرِ مطلق کے ساتھ مربوط ہے۔ وہ ذات ہی اس میں تصرف کرتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور متصرف نہیں ہے۔ اس لیے صرف تذکیر پر اکتفا کیا گیا ہے تاکید کی ضرورت نہیں سمجھی گئی کیونکہ یہ ایک ایسا امر ہے جس سے عقول انکار نہیں کر سکتے۔ اس لیے "لام" تاکید کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

دین میں جبر نہیں ہے

سوال خداوند تعالیٰ کا فرمان ہے: قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ لَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ۝ (التوبہ:۲۹)

"اہلِ کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جنگ کرو جو اللہ اور

روزِ آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور اللہ اور اُس کے رسولؐ نے جو کچھ حرام کیا ہے اُسے حرام نہیں ٹھہراتے اور نہ ہی دینِ حق قبول کرتے ہیں (ان سے جنگ جاری رکھو) یہاں تک کہ وہ ذلیل ہوکر اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں"۔

سوال یہ ہے انسانوں پر اتنا جبر کیوں ہے اُدھر اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ میں فرمایا ہے: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ۔ اِدھر یہ اعلانِ جنگ ایک اور مقام پر قرآنِ کریم میں ہے: فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (الکہف:۲۹)

ایک اور مقام پر ہے: مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (العنکبوت:۱۸، النور:۵۴، المائدہ:۹۹)۔ اس بارے میں وضاحت فرمائیں۔

جواب ان آیاتِ مقدسہ کا حکم عام نہیں ہے بلکہ خاص ہے۔ ان لوگوں کے بارے میں کہا گیا ہے۔ وہ مومن ہوں یا کافر، جو اہلِ ایمان پر ظلم و تعدی کریں اور اللہ کی زمین پر فساد برپا کریں، اس لیے ضروری ہے کہ ایسے لوگوں کو سختی کے ساتھ ظلم و تعدی سے روک دیا جائے۔ جو مظالم اپنے لیے پسند نہیں کرتے اور دوسروں کے لیے جائز سمجھتے ہیں۔

یہ احکام ان لوگوں کے لیے ہیں۔ سورۂ توبہ کی آیت کا مطلب یہی ہے۔ جب اہلِ حق کے خلاف اعلانِ حرب وضرب کر دیا جائے تو یہ حکم ان لوگوں کے بارے میں ہے، جو اہلِ حق کے خلاف جنگ کرنے والے ہوں۔ امن پسند، صلح جُو اور عہد و معاہدہ کرنے والوں کے بارے میں یہ حکم نہیں ہے۔ ہاں اُس وقت یہ حکم نافذ ہوگا جب اہلِ کتاب تمھارے خلاف اعلانِ جنگ کر دیں۔ اہلِ اسلام پر واجب ہو جاتا ہے

کہ انھیں قتل کر دیں۔ اس کے علاوہ خداوند تعالیٰ نے اسی آیت کریمہ کے اندر تصریح بھی فرما دی ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو جنگ کرنے والے ہیں۔ اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور نہ یوم آخرت کو مانتے ہیں، اللہ کے حرام کو حلال سمجھتے ہیں اور دین حق کو تسلیم نہیں کرتے۔ جب ایسے لوگ اہلِ ایمان کے خلاف اعلانِ جنگ کریں تو اہلِ ایمان پر واجب ہو جاتا ہے کہ ان کے شر کو اپنے آپ سے دُور کریں۔

علمِ الٰہی اور قیامِ کعبہ

سوال فرمانِ الٰہی ہے: جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَ الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ الْهَدْيَ وَ الْقَلَآئِدَ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (المائدہ: ۹۷)

"اللہ نے اپنے قابلِ احترام گھر کعبہ، حرمت والے مہینے، قربانی اور جن جانوروں کے گلے میں پٹے باندھے گئے ہوں سب کو لوگوں کے لیے قیام کا ذریعہ بنایا تاکہ تم جان لو کہ اللہ وہ سب کچھ جانتا ہے جو آسمانوں میں اور زمین میں ہے اور یہ کہ اللہ ہر چیز کا خوب علم رکھتا ہے"۔

زمین و آسمان کے درمیان والی تمام اشیاء کے علمِ الٰہی اور خانہ کعبہ کے درمیان کیا ربط ہے؟

جواب خداوند تعالیٰ نے جناب آدمؑ کے زمانے میں اس بقعہ مبارکہ میں اپنے اس محترم گھر کعبہ کو بنایا اور اس لیے اس جگہ پر بنایا تاکہ یہاں سے تہذیب و تمدن پروان چڑھے اور انسان اپنے ارتقائی سفر کا آغاز یہاں سے کرے اور یہ وہ مرکز ہے جہاں انسانی معاشرہ پھلے پھولے اور سیرتِ کاملہ حاصل کرے۔ کعبہ بیت اللہ کوئی

علاقائی مقام نہیں ہے کہ جس کو علاقائی مفادات کے لیے محدود کیا جا سکے۔

کعبہ کے بارے میں ارادہ الٰہیہ یہ ہے کہ وہ ہدایات ربانی کا مرکز ہے اور اس کو وہ ثمرات عطا فرمائے ہیں جو ختم ہونے والے نہیں ہیں اور وہ ثمرات نہ تو قابلِ ادراک ہیں اور نا قابلِ فہم ہیں۔ انسان کے پاس وہ طاقت نہیں ہے جو کعبہ کے مفادات کا احاطہ کر سکے۔

یہ وہ مقام ہے جو مصدر امن ہے۔ یہ امن سب کے لیے ہے اور ہر زمانے کے لیے ہے۔ ہر فرد کے لیے ہے، ہر قوم کے لیے ہے۔ جن نتائج کے ساتھ یہ مربوط ہے وہ نتائج نا قابلِ شمار ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَوَ لَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا (القصص:۵۷) ''کیا ہم نے ایک پُر امن حرم ان کے اختیار میں نہیں رکھا''۔ وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ (العنکبوت:۶۷) ''جبکہ لوگ ان کے گردونواح سے اُچک لیے جاتے تھے''۔

وہ زمانہ جاہلیت میں بھی انسانی معاشرے کا مرکز تھا۔ وہ علم و معرفت کا مرکز ہے جو کچھ اس کے اندر ہے، اس کا احاطہ نا ممکن ہے بلکہ وہ تمام بشریت پر محیط ہے اور ہر زمانے اور ہر صدی کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے لیکن کبھی کسی زمانے میں یہ بھی دیکھا گیا ہے۔ اس عظیم الشان مرکز کو انحرافات نے ہر طرف سے گھیر لیا۔ لوگ اسی کے دامن میں سرکشی و تمرد دکھانے لگے، ظلم و طغیانی ہونے لگا۔ حالانکہ یہ شہر ذاتی طور پر تو ہدایت الٰہیہ کا مصدر تھا۔ طہارت کا معدن تھا، زہد و عبادت کا مدرسہ تھا اور پوری کائنات کے لیے نمونہ عمل تھا۔ یہ بھی تو دیکھنے میں آیا ہے جس شہر کے شہریوں کے لیے جناب خلیل نے دعا مانگی تھی کہ ان کے اقتصادی حالات ہمیشہ بہتر رہیں وہاں اقتصاد و معاش کے مسائل پیدا ہوئے۔ اور لوگ معاشی طور پر بدحالی کا شکار نظر آئے۔ پھر دوسرا دور آیا وہی شہر خوش حالی کا مرکز بن گیا، امن کا گہوارہ بن گیا، دلوں کا مرکز

بن گیا۔ اس کی طرف ہر خطۂ زمین سے لوگ کثرت کے ساتھ آنے لگے۔ خداوند تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا کا ذکر فرمایا ہے:

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ

"اے پروردگار! اس شہر کو امن کا گہوارہ بنا، اس کے اہل کو ہر قسم کے ثمرات سے رزق عطا فرما"۔ (البقرہ:۱۲۶)

ایک دوسرے مقام پر اس شہر کے بارے میں فرمایا:

وَ قَالُوْٓا اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا اَوَ لَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَیْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (القصص:۵۷)

"اور کہتے ہیں: اگر ہم آپ کی معیت میں ہدایت اختیار کریں تو ہم اپنی زمین سے اُچک لیے جائیں گے، کیا ہم نے ایک پُرامن حرم ان کے اختیار میں نہیں رکھا ہے جس کی طرف ہر چیز کے ثمرات کھنچے چلے آتے ہیں؟ یہ رزق ہماری طرف سے عطا کے طور پر ہے لیکن ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے"۔

ایک اور مقام پر حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں فرمایا:

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِیْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْٓ اِلَيْهِمْ وَ ارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ۝ (ابراہیم:۳۷)

"اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی اولاد میں سے بعض کو تیرے محترم گھر کے نزدیک ایک بنجر وادی میں بسایا۔ ہمارے

پروردگار! تا کہ یہ نماز قائم کریں، لہٰذا تو کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور انھیں پھلوں کا رزق عطا فرما تا کہ یہ شکرگزار بنیں"۔

اگر ہم کسی ایسے انسان سے بات کریں جو اللہ کی سرزمین پر اصلاح چاہتا ہے وہ ایک ایسی اصلاحی تحریک چلانا چاہتا ہے جو تمام انسانوں کی ہدایت کا سامان کرے اور انھیں حقیقی انسان بنا دے اور انھیں اسلوبِ حیات عطا کر دے۔ اس کے حضور یہی عرض کریں کہ وہ مکہ کی مثل ایک شہر بنائے جس کو اپنی تحریک کا مرکز قرار دے تو وہ یہی کہے گا کہ آپ مجھ سے مزاح کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا تو کسی سے ممکن ہی نہیں ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے مکہ میں اپنا گھر بنایا اور پوری کائنات کا مصدر بنایا۔ اللہ تعالیٰ نے مُردہ سے زندہ پیدا کیا، ضعف سے طاقت پیدا کی، گمراہی وضلالت سے ہدایت جاری کر دی۔ خوف کو امن میں تبدیل کر دیا۔ مایوسی کے طوفانوں میں اُمید کی کشتی پیدا کر دی۔ کیا یہ امور کافی نہیں ہیں کہ ہم پکار پکار کر کہیں: اَللّٰهُ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔

یہ دنیا صرف کھیل کود ہے

سوال قرآنِ کریم اس دنیا کے بارے میں فرماتا ہے: "یہ صرف کھیل کود ہے" اس کا کیا معنی ہے حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں، کامیابی بھی حاصل کرتے ہیں، ناکامی بھی کماتے ہیں۔ کھاتے بھی ہیں، بناتے بھی ہیں۔ آخر یہ کیا ہے، یہ سب کچھ لہو ولعب ہے، تعمیری کام نہیں ہے؟

جواب بات یہ ہے یہ دنیا آخرت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اس لیے اس دنیا کا نام ہی "دنیا" رکھا گیا ہے جو دنائیت سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آخرت

کے بارے میں فرمایا ہے: اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ (العنکبوت:۶۴) ''اور آخرت کا گھر ہی زندگی ہے اگر انھیں کچھ علم ہوتا''۔

جب آپ کی نگاہ ٹیلی ویژن کی اسکرین پر پڑتی ہے اور آپ کے سامنے ایک تصویر آتی ہے وہ تصویر صرف اور ایک شخص کی تصویر ہے، اس کی مکمل حقیقت نہیں وہ تصویر جتنی بھی خوبصورت ہو لیکن حقیقی خوبصورتی کو نہیں دکھا سکتی۔ یہ تصور صرف ایک حکایت ہے اس طرح یہ دنیاوی زندگی اُخروی زندگی کا معمولی سا عکس ہے، حقیقت نہیں ہے۔ جس طرح ایک تصویر سے پردے نہیں اُٹھ سکتے اسی طرح اس زندگی میں اُس زندگی کو جو اُخروی ہے، نہیں دیکھا جا سکتا۔ اُخروی زندگی میں انسان کے حقیقی ادراکات کھلیں گے اور اُسے حقائق نظر آئیں گے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْیَوْمَ حَدِیْدٌ (قٓ:۲۲)

''آج ہم نے تجھ سے تیرا پردہ اُٹھا دیا ہے لہٰذا آج تیری نگاہ بہت تیز ہے''۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہر چیز کی قیمت کا اندازہ اس چیز سے لگایا جاتا ہے جس چیز کے لیے وہ بنائی گئی ہے۔ یہ دنیا اس لیے بنائی گئی ہے کہ اس میں اپنی اُخروی حیات کو بناتا ہے اور اس کے لیے اپنے آپ کو مہیا و تیار کرتا ہے۔ جب انسان صرف اور صرف اپنے نفس کے لیے زندگی بسر کرتا ہے تو ہر اپنے حقیقی ہدف سے دُور چلا جاتا ہے، تو پھر ایسے انسان کی زندگی صرف اور صرف لہو ولعب رہ جاتی ہے۔

جس طرح ایک بچہ اپنے آپ کو کھیل کود میں مصروف رکھتا ہے۔ جب بچہ کھیل کود میں مصروف ہوتا ہے تو اُس کا اس کھیل کود سے کوئی صالح ہدف نہیں ہوتا تو عقلا بچے کے اس فعل کو پسند نہیں کرتے اور کہتے ہیں: یہ بچہ اپنے وقت و صلاحیت کو برباد کر رہا ہے۔ (اس طرح اس دنیا کے کاموں میں مصروف انسان کو لہو ولعب سے تعبیر کیا

گیا ہے وہ بھی اپنے وقت اور صلاحیتوں کو برباد کر رہا ہوتا ہے)۔

جب وہ اس دنیا کو اپنی کُل کائنات سمجھ لیتا ہے اور اس پر مرمٹتا ہے تو وہ اُس وقت اپنے ہدفِ حقیقی سے دُور چلا جاتا ہے۔ جس کو عقلا پسند نہیں کرتے اور وہ کہتے ہیں کہ وہ تحصیل لاحاصل کے لیے کام کر رہا ہے۔ جس طرح بچے کو کھیل کود میں کچھ نہیں ملتا تو ایسے انسان کو بھی کچھ نہیں ملتا۔

اس لیے اس دنیا کے کارناموں کو بچے کے کھیل کود سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بچے کے کھیل پر کوئی عاقل خاموش نہیں رہ سکتا۔ اس طرح دنیا کے طواف کرنے والے انسان کے اس طواف پر کوئی عاقل خاموش نہیں رہ سکتا۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰکُمْ عَبَثًا وَّاَنَّکُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ○

"کیا تم نے یہ خیال کیا تھا کہ ہم نے تمہیں عبث پیدا کیا تھا اور تم ہماری طرف پلٹائے نہیں جاؤ گے"۔ (المومنون: ۱۱۵)

اگر یہ نظریہ ہو کہ آخرت کا تصور غلط ہے کوئی ثواب وعتاب والی بات نہیں تو پھر یہ دنیا اور اس کے تمام معاملات عبث و بے فائدہ ہوں گے۔ دنیاوی زندگی بے فائدہ اور بے نتیجہ ہو کر رہ جائے گی۔

یہ دنیا نہ تو کسی کو اس کی اچھائی کا صلہ دے سکتی ہے اور نہ کسی کو اس کی برائی کی سزا دے سکتی ہے۔ اگر آخرت کا نظریہ ہٹا دیں تو پھر اس دنیا کی خلقت کا کوئی فائدہ ہی نہیں رہتا۔

❋......❋......❋

تیسرا حصّہ

قرآن و امامت

دین مکمل ہوگیا

سوال آپ کا کہنا ہے کہ یہ آیت کریمہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ ......(المائدہ:۳) اس وقت نازل ہوئی جب حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علیؑ کو غدیر کے دن بطور امام (خلیفہ) مقرر فرمایا تو اس تقرر کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔ اس آیت سے قبل آیت یٰاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ (المائدہ:۶۷) نازل ہوئی تھی۔ جب کہ آیتِ اکمال سورۂ مائدہ کی آیت نمبر۳ ہے اور آیتِ ابلاغ امامت سورۂ مائدہ کے وسط میں ہے جس کا نمبر ۶۷ ہے۔ حالانکہ ابلاغ امامت والی آیت کو سورہ کے اوّل میں آنا چاہیے تھا اور آیتِ اکمال کو اس کے بعد آنا چاہیے تھا۔ یہ اس طرح کا عکس کیوں ہے حالانکہ قرآن تدریجاً نازل ہوا ہے۔ پہلا حکم پہلے اور بعد والا حکم بعد میں۔ یہاں بعد والا پہلے اور پہلے والا بعد میں کیوں ہے؟

جواب بسم اللہ...... امابعد! اس سوال کے جواب کے لیے چند ایک تفصیلات کی ضرورت ہے۔ تب جا کر بات سمجھ میں آئے گی۔ سب سے پہلے ہم مرتکزات ایمانی

پر گفتگو کریں گے۔

ایمان بالنبوت کے دو طریقے ہیں: پہلا طریقہ یہ ہے: ایمان کو عقل کے ذریعے درک کرنا، فطرت کا فیصلہ کہ پیغمبر گرامیؐ نے جو کچھ پیش کیا ہے وہ حق اور سچ ہے۔ عقل کے ادراک اور فطرت کے عظیم الشان فیصلے کی مثال ایمان ابوطالبؑ وحمزہؓ و جعفرؓ اور جناب خدیجہؑ ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی ہیں جنھوں نے فوری طور پر پیغمبرؐ کو تسلیم کر لیا تھا۔ ان احباب کا اقرار و تسلیم عقل اور فطرت کی بنیاد پر تھا۔ انھیں معجزہ کی ضرورت نہ پڑی۔ یہ وہ لوگ تھے جنھیں رسولؐ اللہ کی معرفت قریب سے حاصل تھی اور وہ حیاتِ پیغمبرؐ پر پوری پوری نگاہ رکھتے تھے۔ وہ آپؐ کی صفات اور صدق وصفا سے مکمل آگاہی رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جو کرامات اپنے پیغمبرؐ کو عطا فرمائی تھیں ان کو دیکھ چکے تھے۔ پیغمبر اکرمؐ جو کچھ لائے اُسے دل و جان سے تسلیم کیا۔ ایسے صاحبانِ ایمان کے ایمان کو بصیرت کا نام دیا گیا ہے۔ ان لوگوں نے عدل و انصاف سے کام لیا۔

اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ اگر سارے لوگ ایسی صفات کے حامل ہوتے یا وہ حق و حقیقت کو پانے کے لیے بھرپور سعی کرتے اور انھی اُمور کو اپنے اُوپر لازم کرتے تو وہ کبھی بھی حق سے دُور نہ جاتے اور ان سے کسی قسم کا تجاوز نہ ہوتا۔

اگر لوگ اسی منہاج کو اختیار کرتے تو وہ قطعاً آیات ومعجزات طلب نہ کرتے، خصوصاً توحید اور اُس کی اطاعت اور عبادت کے بارے میں جو کچھ خداوند تعالیٰ نے اپنے رسولؐ پر نازل فرمایا اُسی پر اکتفا کرتے اور اس کے علاوہ تفصیلات نہ چاہتے۔ تو پھر ان کے تمام امورِ زندگی حکمت ودانش کے مطابق ہوتے۔ اس طرح پوری کائنات کو ہدایت ملتی۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ سب کچھ اس وقت ممکن ہے جب فطرتِ سلیم ہو اور

عقل مستقیم ہو، عجز و انکسار ہو۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے فرمایا:

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ○

"کیا تم نے یہ خیال کیا تھا کہ ہم نے تمھیں عبث پیدا کیا تھا اور تم ہماری طرف نہیں پلٹائے جاؤ گے۔ (المومنون:۱۱۵)

حالانکہ یہ خطاب خداوندی لوگوں کے عقول سے ہے۔ اس آیت میں اس کو بیان کیا جا رہا ہے کہ تم اس کا ادراک کرو اور اس پر ایمان لاؤ۔ اس لیے فرمایا:

قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ○ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ۙ (یٰس:۷۸-۷۹)

"اور کہنے لگتا ہے ان ہڈیوں کو خاک ہونے کے بعد کون زندہ کرے گا؟ کہہ دیجیے انھیں وہی زندہ کرے گا جس نے انھیں پہلی بار پیدا کیا تھا اور وہ ہر قسم کی تخلیق کو خوب جانتا ہے"۔

اس آیت کے علاوہ اور بہت سی آیات ہیں جن کے ذریعے عقلِ انسانی حکم لگاتی ہے، فطرتِ صافیہ اس کی تائید کرتی ہے۔

ایک دوسرا طریقہ جس کے ذریعے لوگ ایمان لائے وہ ہے معجزہ جس کے ذریعے عذر و حیلے کی راہیں مسدود ہو کر رہ گئیں اور عقل کو اقرار و تسلیم کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

اس اعتبار سے عادات و اطوار کے اعتبار سے لوگوں کی دو قسمیں بنتی ہیں:

نوعِ اوّل: یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے معجزہ دیکھا پھر بھی ان کی دلی خواہش رہی کہ اس عقیدہ و مذہب کو نہ چھوڑیں جس پر وہ تھے۔ انبیاء علیہم السلام کی دعوات ان پر بھاری گزریں۔ انھوں نے انکار کیا اور جھٹلا دیا۔

نوعِ ثانی: یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے معرفتِ حق کی طرف رغبت کی اور دعوت

کو قبول کیا۔ لیکن اس اقرار و تسلیم میں وہ جعفرؓ و حمزہؓ و خدیجہؓ کی مثل نہ ہوئے۔ جیسے انھوں نے اقرار و تسلیم کا مظاہرہ کیا اس منزل پر باقی یہ لوگ نہ تھے۔

ان دوسری نوع کے لوگوں کو اس امر کی ضرورت رہی کہ ان کے لیے وہ عوامل پیدا ہوں جو دین کی حقانیت کو قبول کرنے میں ان کے لیے ممد و معاون ثابت ہوں اور وہ اللہ تعالیٰ سے مربوط ہو جائیں۔

قرآن کریم وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور رسول اکرم کا معجزہ ہے لیکن اس کے معانی و مطالب کا حصول و ادراک ہر شخص کے امکان میں نہیں ہے کیونکہ انسان اپنی فطری ساخت یا دوسرے عوامل کی وجہ سے ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ان کا کوئی بڑا ہے اور کوئی چھوٹا۔ کوئی ذکی ہے اور کوئی غبی کوئی عالم ہے تو کوئی جاہل انھیں تغیر و تبدل کی بنا پر ایمان و ہدایت ربانی کے احوال میں جو جتنا قرآن کے قریب ہوا وہ اتنا ہدایت ربانی کے قریب ہوا۔

اب ضرورت اس امر کی ہے ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو قرآن کریم کے حقائق پر مکمل ادراک نہیں رکھتے تھے حالانکہ قرآن ہر اعتبار سے معجزہ ہے۔ چاہے اس کے تشریعی امور ہوں یا اس کے علمی و بلاغی امور ہوں۔ اس کے اعجاز کے کتنے زاویے ہیں جس کے عرفان سے لوگ کوسوں دور ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ اُس وقت تک اپنے اسلام و ایمان کو مستحکم نہ کر سکے جب تک ان کے سامنے قرآن کی پیشین گوئیاں حرف بحرف ثابت نہ ہو سکیں۔ جب ان لوگوں نے قرآن کا فرمان اپنی آنکھوں کے سامنے پورا ہوتے دیکھا تو پھر ان کا ایمان مضبوط ہوا جیسے روم کے مغلوب ہونے کی پیشین گوئی تھی۔

فرمانِ خداوندی ہے:

غُلِبَتِ الرُّوْمُ ○ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ

سَيَغْلِبُونَ ○ (الروم:۲-۳)

اس کے علاوہ بہت سی پیشین گوئیاں ہیں۔

لوگوں نے اپنے اپنے اعتبار سے قرآن کا ادراک کیا۔ اس میں زندگی کے مختلف طبقات تھے۔ ان طبقات میں اعلم بھی تھے، نابغہ دہر بھی تھے۔ اس طرح ان لوگوں کی کثرت تھی جو نہایت ہی سادہ اور سطحی ہے۔

خداوند تعالیٰ نے اس وسیلہ سے ظاہراً اپنے نبی پر مکمل سورہ نازل فرمائی اور پیغمبر اکرمؐ نے وہی سورہ مکمل طور پر لوگوں میں پڑھی۔ پھر اس سورہ سے متعلقہ واقعات ثابت ہوتے۔ جب کوئی واقعہ رونما ہوتا تو جناب جبرئیل امینؑ اس واقعہ سے مربوط آیات لے کر نازل ہوتے اور لوگ دیکھتے یہی آیات تو فلاں سورہ کے ضمن میں ایک گھنٹہ یا ایک دن یا ایک ماہ قبل نازل ہو چکی ہیں۔ جس کا ادراک ذکی و غبی برابر کرتے اور سمجھ لیتے یہ قرآن واقعی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہے کہ وہ اللہ یکتا ہے اور لاشریک ہے۔ اور یہ وہ لوگ تھے جو نبی اکرمؐ کو قریب سے جانتے تھے اور آپؐ کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے اور آپؐ کو طرز زندگی میں اپنے جیسا پاتے تھے۔ جو وسائل زندگی ان کے تھے وہی وہ وسائل آپؐ کے تھے جو ان سب کی نظروں کے سامنے تھے۔ بعدازیں ہم یہ کہیں گے اس سوال کے جواب کی مزید وضاحت کی ضرورت ہے وہ درج ذیل ہے:

نزولِ سورۂ مائدہ

روایات کے مطابق سورہ مائدہ دفعتہً نازل ہوئی۔ چند ایک رواۃ کے اسما درج ذیل ہیں:

① عبداللہ بن عمرو: انھوں نے کہا: جب سورۂ مائدہ رسول اکرمؐ پر نازل ہوئی تو آپؐ سواری پر سوار تھے۔ سواری بوجھ نہ اٹھا سکی تو آپؐ نیچے اتر آئے۔ (درمنثور،

ج ۲، ص ۲۵۲، عن احمد)

② اسماء بنت یزید: فرماتی ہیں: عضبا ناقہ کی مہار ہاتھوں میں تھامے ہوئی تھی جب پیغمبر اکرمؐ پر سورۂ مائدہ نازل ہوئی تو ناقہ کا شانہ بوجھ کی وجہ سے جھک گیا۔ (درمنثور، ج ۲، ص ۲۵۲، عن احمد وعبد بن حمید وابن جریر، محمد بن نصر والطبرانی، وابونعیم فی الدلائل والبیہقی فی شعب ایمانی)

③ اُم عمر بنت عبس سے روایت کی گئی ہے اُنھوں نے اپنے چچا سے روایت کی وہ اس سفر میں رسولؐ اللہ کے ہمراہ تھے۔ جب سورۂ مائدہ نازل ہوئی تو پیغمبر کی ناقہ عضبا کا شانہ ثقل کی وجہ سے جھک گیا۔ (درمنثور، ج ۲، ص ۲۵۲، ابن ابی شیبہ نے اپنی مسند میں، بغوی نے معجمہ میں وابن مردویہ اور بیہقی نے دلائل نبوت میں)

④ محمد بن کعب قرظی نے کہا: سورۂ مائدہ جب رسولؐ اللہ پر نازل ہوئی تو آپؐ اس وقت حجۃ الوداع سے مکہ اور مدینہ کے درمیان سفر فرما رہے تھے۔ آپؐ اس وقت اپنی ناقہ عضباء پر سوار تھے تو ثقل کی وجہ سے ناقہ کا شانہ جھک گیا۔ آپ اپنی ناقہ سے نیچے اُتر آئے۔ (درمنثور، ج ۲، ص ۲۵۲، عن ابی عمید)

⑤ ربیع بن انس سے روایت ہے: سورۂ مائدہ حجۃ الوداع کے موقع پر وہاں سے مدینہ کی طرف روانگی کے دوران سفر میں نازل ہوئی۔ اس وقت آپؐ اپنی ناقہ عضبا پر سوار تھے۔ سورہ کے ثقل کی وجہ سے ناقہ بیٹھ گئی۔ (درمنثور، ج ۲، ص ۲۵۲، عن ابی جریر)

تاریخ نزول سورۂ مائدہ

سورۂ مائدہ کی تاریخ نزول میں اختلاف ہے جو امر اہم ہے وہ یہ ہے:

① ایک روایت میں ہے یہ سورہ اس وقت نازل ہوئی جب آپؐ حدیبیہ سے چلے۔ (الجامع لاحکام القرآن، ج ۶، ص ۳۰)

② قرطبی نے کہا: یہ سورہ حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی۔
روایت یہ بھی ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر نازل ہوئی۔ (جامع لاحکام القرآن، ج ۶، ص ۳۰)

کتب میں یہ بھی موجود ہے کہ اس سورہ کی آیات تدریجاً نازل ہوئیں۔ یہ اس سورہ کا دوسرا نزول ہے۔ پہلا نزول جو دفعۃً ہوا تھا، اس کا غیر ہے جیسا کہ واضح ہے۔
ان آیات کو اس سورہ میں اس طرح رکھا گیا جس طرح یہ آیات اب سورہ میں موجود ہیں۔

آیات کی ترتیب توقیفی کے بارے میں کہا گیا ہے اور اس پر اجماع ہے۔ مترادف نصوص کی دلالت موجود ہے کہ آیات کی ترتیب توقیفی ہے۔ اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ (الاتقان، ج ۱، ص ۲۴)

کثرت کے ساتھ روایات میں موجود ہے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ان آیات کو اس سورہ میں اس مقام پر رکھو جہاں اب موجود ہیں۔ اس طرح ابن عباسؓ سے بھی روایت موجود ہے۔[①]

حضرت عثمان بن عفان سے بھی روایت ہے۔[②]

---

① در منثور، ج ۱، ص ۷، عن الحاکم و صححہ۔ ابن داؤد، بزاز، طبرانی نے معرفت ابی شعب الایمان میں، ترمذی نے ج ۲، ص ۲۷۲، تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۴۳، الاتقان، ج ۱، ص ۶۲، البرہان زرکشی، ج ۱، ص ۲۴۱۔ ترمذی سے حاکم سے تمہید، ج ۱، ص ۲۱۳، تاریخ قرآن صغیر، ص ۸۱، عن مدخل الی القرآن، ص ۴۳، غرایب القرآن نیشاپوری، طبری، جامع البیان، ج ۱، ص ۴۳، مناہل العرفان، ج ۱، ص ۲۴۰۔ ان تمام نے پیغمبر اکرمؐ کی حدیث نقل کی ہے۔ آپ نے فرمایا: ان آیات کو اس سورہ میں اس مقام پر رکھو (جہاں اب یہ آیات موجود ہیں)

② در منثور، ج ۳، ص ۲۰۷-۲۰۸، عن ابی شیخ و ابن مردویہ۔ مشکل الآثار، ج ۲، ص ۱۵۲۔ البیان، ص ۲۶۸، عن بعض من تقدم۔ الضیا اپنے مختارہ میں، منتخب کنز العمال بحاشیہ مسند احمد، ج ۲، ص ۴۸، بحوث فی تاریخ القرآن وعلومہ، ص ۱۰۳، مناہل العرفان، ج ۱، ص ۳۴۷، مباحث فی علوم القرآن، ص ۱۴۲، عن بعض من تقدم،

ایک اور نص بھی ہے: جناب جبرئیلؑ نے فرمایا: اس آیت کو اس جگہ رکھو۔ بعض روایات میں آیا ہے: مسلمان اس سورہ کی ابتدا اور انتہا کو صرف اسی صورت میں جانتے تھے جیسے اب ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور ابتدا اور انتہا نہیں جانتے تھے۔ اس روایت کے راوی جناب ابن عباس[①]، سعید بن جبیر[①] اور ابن مسعود[①] ہیں۔

اہداف

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ وَحۡیٌ یُوحٰی کے مصداق تھے۔ وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں فرماتے تھے اور نہ اپنی طرف سے کچھ کرتے تھے۔ جب جبرئیلؑ امین وحی لائے یا فرمانِ خداوندی بیان کرتے تو اُس کے مطابق آپؐ کام انجام دیتے تھے۔ جہاں مصلحت کے مطابق آیت رکھنے کا حکم ملتا تو آپؐ وہاں اس آیت کو رکھتے تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ آیت اکمال کو آیت امر تبلیغ سے پہلے رکھا گیا اور کیوں رکھا گیا؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مصلحتِ پروردگار کے مطابق ایسا کیا گیا۔ ہم جانتے ہیں قرآنی آیات اور اس طرح سورتیں تاریخ نزول کے مطابق جمع نہیں کی گئیں۔

تاریخ القرآن الصغیر، ص ۹۲۔ ابوشامہ سے روایت ہے:۔ الرشد الوجز میں و جواہر الاخبار والآثار میں، بحر زخار، ج ۲، ص ۲۳۵، ابوداؤد، ترمذی، سنن ابی داؤد، ج ۱، ص ۲۰۹۔ سنن الکبریٰ بیہقی، ج ۲، ص ۴۲۔ احکام القرآن الجصاص، ج ۱، ص ۱۰ و مسند احمد، ج ۱، ص ۵۷ تا ۶۹۔

مستدرک حاکم، ج ۲، ص ۳۳، ص ۲۲۱۔ تلخیص ذہبی، غریب الحدیث، ج ۳، ص ۱۰۳۔ البرہان زرکشی، ج ۱، ص ۲۳۳-۲۳۵ و ص ۶۱۔ غرائب القرآن بھامش، جامع البیان، ج ۱، ص ۲۱۔ فتح الباری، ص ۹-۱۹-۲۰-۳۹۔ کنز العمال، ج ۲، ص ۳۶۷ عن ابی عبید۔ ابن ابی شیبہ، احمد و ابی داؤد، الترمذی، ابن المنذر، ابن ابی داؤد، ابن الانباری، النحاس، ابن حیان، ابی نعیم معرفت میں، الحاکم، سعید بن منصور، النسائی، البیہقی، فواتح الرحموت بھامش المستصفی، ج ۲، ص ۱۲

① در منثور، ص ۷، عن حاکم، البیہقی، سنن میں

① در منثور، ج ۱، ص ۷، راوی ابی عبید

① در منثور، ج ۱، ص ۷، راوی واحدی و بیہقی شعب الایمان میں۔

بلکہ مدینہ میں نازل ہونے والی بہت سی سورتوں میں مکی آیات ہیں اوراس کے برعکس مکی سورتوں میں مدنی آیات ہیں۔

اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان دو آیات کا ایک دوسرے سے الگ ہو جانا یا آگے پیچھے ہونا، کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ ہر صورت کی آیات کو پیغمبرؐ کے فرمان کے تحت رکھا گیا ہاں البتہ آیات اگر تاریخ نزول کے مطابق جمع کی گئیں ہوتیں پھر یہ فاصلہ ہوتا تو اعتراض کیا جاسکتا تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ ان دو آیات کے درمیان فاصلہ یا تفریق اس میں الٰہی سیاست ہے اور اس میں مصالح کی رعایت کی گئی ہے۔ مصلحت کیا تھی؟ وہ مصلحت امامت کی حفاظت تھی اور لوگوں کے ایمان کی حفاظت کا پروگرام تھا۔

ممکن ہے غدیر سے مربوط آیت کو حلال وحرام غذاؤں سے متعلق آیت میں تحریف وحذف اور تغیر سے محفوظ رکھنے کے لیے ہو۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک نفیس چیز کو محفوظ رکھنے کے لیے عام سی چیزوں میں رکھ دیا جاتا ہے تاکہ اس کی طرف توجہ کم ہو۔ امامت امیر المومنینؑ کی حفاظت مصلحت پروردگار تھی اس لیے قرآن کریم کو تحریف وتغیر سے بچانا تھا اور اسلام کے پروگراموں میں تھا کہ اُس کے مقدسات محفوظ رہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہ ہونے پائے۔ اس طرح امام علیؑ کے جہاد کی بھی اسلام کو ضرورت تھی اور یہ جہاد ذلالت ورسوائیوں اور طاغوتوں کے طغیان وعدوان کے خلاف تھا۔ پیغمبرؐ کے اردگرد اکٹھے ہونے والے کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اپنے سینوں میں کینہ وحسد رکھتے تھے۔ پیغمبرؐ کے وصال کے بعد جو کچھ ہوا وہ بیان کا محتاج نہیں ہے۔

(۱) پیغمبر اکرمؐ اپنے بعد آنے والے حالات وانقلابات سے آگاہ تھے کہ اُن کے بعد کیا ہونے والا ہے۔ کیونکہ آپؐ نے اپنی تلوار کے ساتھ سرکشوں اور طاغوتوں کی گردنوں کو قطع کیا تھا۔ اپنی طاقت سے اشرار کو ان کے شر سمیت ختم کیا تھا۔ یہی وہ

اسباب تھے جن کی بنا پر ان لوگوں کے دل آپؑ کے لیے صاف نہ تھے۔ کینہ و حسد ان کے قلوب میں بھرا ہوا تھا۔ رسولؐ اللہ کی محبت جو ایمان تھی اور آپؑ سے محبت رکھنا اپنے کفو سے بھی بڑھ کر واجب تھا لیکن ایسا نہیں تھا، کیونکہ انسان اُس وقت دائرۂ اسلام میں داخل ہو سکتا ہے جب وہ رسولؐ اللہ سے اپنے نفوس سے بھی زیادہ محبت رکھتا ہو ورنہ داخل ہی نہیں ہو سکتا۔

آپ کو معلوم تھا کہ ان کے بعد ایک ایسا شخص آنے والا ہے جو سب کچھ تہس و نہس کر کے رکھ دے گا۔

۲ اس کے علاوہ آپ کے سامنے وہ حالات بھی تھے، قبائل کا مقاتلہ ہوگا۔ ان حالات میں آپؑ کے سامنے اپنے تحفظات تھے کہ ان کے اہلِ بیتؑ کے ساتھ جو سلوک ہونا تھا وہ آپؑ کے سامنے تھا۔ اس لیے آپؑ کے سامنے کثیر تعداد میں سوالات تھے۔ ان کی طرف سے منسوب عامل کو کمزور کر دیا جائے گا۔ کیونکہ لوگ دائرۂ اسلام میں داخل تو ہو گئے تھے لیکن ابھی تک ان میں روح جاہلی موجود تھی وہ نہیں بدلی تھی۔ ان کے نفوس کا تزکیہ نہیں ہوا تھا۔ روح میں خلوص الٰہی پیدا نہیں ہوا تھا۔ آخر ان اسباب کا نتیجہ کیا نکلے گا وہ نیکوں کا قتل ہوگا، انتشار و افتراق ہوگا، اہلِ دین کا کمزور کرنا ہوگا۔

جب ہم پیغمبرؐ کے بعد کے ادوار کو دیکھتے ہیں تو آخر وہی ہوا جو پیغمبرؐ نہیں چاہتے تھے۔ آخرکار انھی حالات کے سبب حضرت امیرالمومنینؑ کو صفین میں جانا پڑا۔ میدانِ صفین میں قبائل قبائل سے لڑ رہے تھے۔ شام کے تمیم عراق کے تمیم سے لڑ رہے تھے۔ شام کے ربیعہ قبیلہ کے لوگ عراق کے ربیعہ والوں سے لڑ رہے تھے۔ اس طرح تمام قبائل آپس میں جنگ کر رہے تھے۔ حالانکہ یہ قبائل کی جنگ نہیں تھی بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ فتنہ کا خاتمہ ہو۔ یہ لوگ اپنے قبیلے کے خلاف حضرت امام علیؑ کے ساتھ میدانِ

جنگ میں کھڑے ہو کر فتنہ کا قلع قمع چاہتے تھے۔

(۳) پیغمبر اکرمؐ کا تیسرا مقصد یہ تھا کہ اُس کے اہلِ بیتؑ کا دفاع ہو جائے کیونکہ وہ بزرگوار دین خداوندی کے حامی و ناصر تھے، اس لیے آپؐ نے اپنے اہلِ بیتؑ کو مقدم رکھا اور حضرت امام علیؑ کو اپنا جانشین بنایا، کیونکہ وہ اللہ کے دین کے ناصر تھے اور اللہ کے دشمنوں کو قتل کرنے والے تھے، اور اس اُمت کے شہداء تھے اور اسلامی وحدت کے امین تھے، اور اسلام کی اور اُمت مسلمہ کی عزت و کرامت کے محافظ تھے۔

جب لوگوں نے حضرت امام علی علیہ السلام اور ان کے اہلِ بیتؑ سے انتقام لینا چاہا اور ان پر اپنے احکام نافذ کرنے لگے تو ان حالات میں امام علیؑ اور ان کے اہلِ بیتؑ نے صبر و شکر سے کام لیا اور ان سے نرمی اور حسنِ سلوک کا برتاؤ کیا۔ اہلِ بیتؑ کی طرف سے یہ سب کچھ دین کی حفاظت کا پروگرام تھا۔

رسول اکرمؐ نے دین کی حفاظت کے لیے لوگوں کو انکار و عناد سے منع کیا۔ انھیں باطنی کینہ سے بچانے کی کوشش کی۔ قرآن کریم کو تحریف سے بچانے کی بھرپور کوشش کی۔ دین اور اس کے پیروکاروں پر خروج کی ممانعت فرمائی۔ آپؐ دیکھ رہے تھے اگر ایسا ہو گیا تو پھر اسلامی معاشرہ تباہ ہو جائے گا۔ تمام انبیاءؑ کی محنت رائیگاں جائے گی اور خونِ شہداءؑ ضائع ہو جائے گا۔

اس لیے آپؐ ان کے لیے سراپا رحمت بن کر آئے۔ آپؐ نے ان کے ساتھ مکمل رفاقت اپنائی، ان کے لیے اور ان کی اولادوں کے لیے ایمان میسر کیا۔ اس کے علاوہ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کریم میں امام علیؑ کا اسمِ گرامی اس لیے نہیں آیا تاکہ قرآن محفوظ رہے اور اس میں تحریف نہ ہو۔ کیونکہ اس اُمت کے کچھ ایسے شریر تھے جن سے قرآن کی تحریف و توہین کے تمام پہلوؤں کی توقع تھی۔ وہ جس نے قرآن

کو تیروں سے چھلنی چھلنی کر ڈالا اور کہا:

تَتَمَدُّدُنِیْ بِجَبَّارٍ عَنِیْدٍ
فَهَا اَنَا ذَاكَ جَبَّارٌ عَنِیْدٌ
اِذَا مَا جِئْتَ رَبَّكَ یَوْمَ حَشْرٍ
فَقُلْ یَا رَبِّ مَزَّقَنِیْ الْوَلِیْدُ

"اے قرآن! تو مجھے جبار عنید کے حوالے سے دھمکیاں دیتا ہے، عناد رکھنے والا جبار تو میں ہوں۔ جب قیامت کا دن آئے اور تو اپنے رب کے پاس جائے تو کہہ دینا ولید نے مجھے پارہ پارہ کر دیا تھا"۔

جی ہاں! یہی وہ اسباب تھے جن کی بنا پر امام علیؑ کا اسمِ مبارک قرآنِ مجید میں بالصراحت نہیں آیا لیکن آپؑ کی قربانیوں کا آپؑ کے کارناموں کا تذکرہ قرآن کریم نے اپنے اندر محفوظ کر لیا ہے۔ جس طرح آپؑ نے رکوع کی حالت میں انگوٹھی تصدق فرمائی یا اس کے علاوہ وہ بہت سی آیات ہیں جو آپؑ کی شان میں نازل ہوئیں۔ انھی آیات میں سے آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ ......الخ، اور آیت امر بلاغ رسالت ہے۔ یہ وہ آیات جو بتاتی ہیں کہ خلافت و امامت امام علی علیہ السلام کا حق ہے اور ان کی امامت دین کی اساس ہے۔

یہ آیات اپنے مفہوم کے اعتبار سے ظاہر و باہر ہیں۔ حضرت امام علی علیہ السلام کا اسمِ گرامی قرآن مجید میں نہیں۔ یہ بھی سیاست الٰہیہ کا حصہ ہے۔ اس ضمن میں حضرت امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

خداوند تعالیٰ نے اپنے بندوں پر واضح انداز میں فرمایا: "خلافت و امامت کا استحقاق کس طرف جاتا ہے اور رسولِ اکرمؐ نے امامت و خلافت کا مسئلہ لوگوں کو اس

طرح بتایا جس طرح نماز و زکوٰۃ اور دوسرے مسائل شرعی بتائے"۔

حضرت امام صادق علیہ السلام سے جب پوچھا گیا کہ حضرت علیؑ اور اہلِ بیتؑ کے اسماء قرآنِ مجید میں کیوں نہیں آئے۔ لوگ اس امر کا ہم سے سوال کرتے ہیں۔ آپ اس مسئلہ کو حل فرمائیں تو آپؑ نے فرمایا: ان سے کہہ دو رسولؐ اللہ پر نماز نازل ہوئی تو نماز کی تفصیل نازل نہیں ہوئی کہ دو رکعتیں ہیں یا تین یا چار، یہاں تک کہ رسولؐ اللہ نے نماز کی تفسیر بتائی۔ آپؐ پر زکوٰۃ نازل ہوئی۔ قرآن نے وضاحت نہیں فرمائی کہ ہر چالیس درہم پر ایک درہم ہے۔ اس امر کی بھی وضاحت رسولؐ اللہ نے فرمائی۔ آیت نازل ہوئی: اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ (سورۂ نساء:۵۹) یہ آیت حضرت علیؑ، حضرت امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے حق میں نازل ہوئی اور رسولؐ اللہ نے حضرت امام علی علیہ السلام کے حق میں فرمایا: مَنْ کُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاهُ۔

رسولؐ اللہ نے فرمایا:

> اُوْصِیْکُمْ بِکِتَابِ اللّٰهِ وَاَهْلِ بَیْتِی ، فَاِنِّیْ سَالت الله عَزَّوَجَلَّ لَا یُفَرِّقُ بَیْنَهُمَا حَتّٰی یرهما علی الحوض فَاَعْطَانِیْ ذٰلِكَ......
>
> "میں تمھیں اللہ کی کتاب اور اپنے اہلِ بیتؑ کے بارے میں وصیت کرتا ہوں۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے ان دونوں کے بارے میں دعا مانگی ہے۔ وہ خدا ان دونوں کے درمیان جدائی نہیں ڈالے گا یہاں تک کہ ان دونوں کو حوضِ کوثر مجھ پر وارد فرمائے گا"۔

آپؐ نے ان کے بارے میں فرمایا:

> لَا تَعَلِّمُوْهُم فَهُم اَعْلَمُ مِنْكُم

"تم انھیں نہ پڑھاؤ وہ تم سے اعلم ہیں"۔

آپؐ نے یہ بھی فرمایا:

إِنَّهُم لَن يَخرِجُوكُم مِنْ بَابِ هُدَى وَلَن يَدخُلُوكُم فِي بَابِ ضَلَالَةٍ

"یہ تم کو باب ہدایت سے نہیں نکالیں گے اور باب ضلالت میں داخل نہیں کریں گے"۔

یہ کہہ کر اگرچہ رسول اللہ خاموش ہو گئے اور نہیں فرمایا: میرے اہلِ بیتؑ کون ہیں کہ ان کا نام لیں۔ وہ فلاں ہے، وہ فلاں ہے لیکن خداوند تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اپنے نبیؐ کی تصدیق فرمائی ہے۔ فرمایا:

إِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ○ (الاحزاب:۳۳)

تو اس اہلِ بیتؑ کے مصداق علی، حسن، حسین اور فاطمہ علیہم السلام ہیں۔ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب رسول اللہ حضرت اُم سلمہؓ کے گھر ان سب کے ساتھ چادر کے نیچے تھے۔ (کافی، ج ا،ص ۲۸۷-۲۸۸ و تفسیر صافی، ج ا،ص ۳۶۲، العیاشی، نور الثقلین، ج ا،ص ۵۰۲ و کنز الدقائق، ج ۳،ص ۳۳۱-۳۳۲)

ابلاغ سے قبل رسول اللہ پر نزولِ قرآن

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْاٰنُ (البقرہ:۱۸۵)

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

إِنَّآ أَنزَلْنٰهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ (القدر:۱)

یہ آیات دلالت کرتی ہیں کہ قرآنِ مجید لوحِ محفوظ پر تھا جیسا کہ قرآن میں آیا

ہے: فِیۡ لَوۡحٍ مَّحۡفُوۡظٍ (البروج:۲۲) ایک اور مقام پر ہے: وَاِنَّہٗ فِیۡۤ اُمِّ الۡکِتٰبِ لَدَیۡنَا لَعَلِیٌّ حَکِیۡمٌ (زخرف:۴)

اہلِ سنت کی روایت ہے کہ قرآن پہلی دفعہ مکمل طور پر آسمانِ دنیا پر نازل ہوا پھر زمین پر تدریجاً نازل ہوا۔ (الاتقان، ج ۱، ص ۳۹-۴۰)

اجماع نے بھی اسی امر کی حکایت کی ہے۔ (الاتقان، ج ۱، ص ۴۰-۴۴)

یہاں اور بہت سی روایات ہیں: قرآن کریم سب سے پہلے مکمل طور پر بیتِ معمور پر نازل ہوا جو چوتھے آسمان پر ہے۔ (الصافی، ج ۱، ص ۶۴۔ البحار، ج ۵۵، ص ۵۵ تا ۵۷۔ محاسبۃ النفس ابن طاؤس، تفسیر قمی، ج ۳، ص ۳۳۱، سفینۃ البحار، ج ۲، ص ۴۷۷)

شیخ مفید نے کوئی ایسی روایت بیان نہیں کی کہ جس کی وجہ سے ان روایات کی صحت ممکن ہو۔ (تصحیح الاعتقاد، ص ۵۸، زنجانی، ص ۱۰۔ المیزان، ج ۲، ص ۳۹۔ تفسیر صافی، مقدمہ ۹، تاریخ القرآن زنجانی، ص ۱۰)

راویوں نے کہا: قرآن کریم دفعتہً واحدہ پیغمبر گرامیؐ کے قلب مبارک پر نازل ہوا لیکن اُس وقت آپؐ کو قرآن کے ابلاغ کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔ بعض شواہد سے یہ قول صحیح نظر آتا ہے۔

یہ روایات واقوال تمام کے تمام صحیح ہیں، کیونکہ قرآن کی عظمت مراتبِ نزول کا تقاضا کرتی ہے۔ پس سب سے پہلے لوحِ محفوظ پر اُترا۔ پھر بیتِ معمور پر پھر آسمانِ دنیا پر نازل ہوا۔ پھر لوگوں کی تبلیغ کے لیے نازل ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے ماہِ رمضان میں نازل فرمایا اور رسولؐ اللہ کے قلبِ مبارک پر نازل فرمایا۔ پھر سورہ سورہ کی شکل میں نازل ہوتا رہا۔ جب نازل اس صورت میں ہوتا تو پیغمبر گرامیؐ لوگوں پر قرأت فرماتے۔ پھر آیات جدا جدا صورت میں بھی نازل ہوئیں۔ جب کوئی واقعہ درپیش ہوتا تو اُس کی مطابقت سے آیات نازل ہوتی رہیں۔

بعثت نبویؐ

سوال ہے کہ آپؐ نبوت پر کب مبعوث ہوئے۔ جواب یہ ہے: جب آپؐ کی عمر مبارک چالیس ہوئی تو آپؐ نے اپنی نبوت کا اعلان فرمایا حالانکہ آپؐ اپنی پیدائش ہی سے نبی تھے۔ علامہ مجلسی نے اس امر پر بہت سے شواہد پیش کیے ہیں۔ (بحار، جلد ۱۸، ص ۲۷۷ تا ۲۸۱)

إِنَّهُ كَانَ نَبِيًّا وَّآدَمُ بَيْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ

"آپ اس وقت نبی تھے جب جناب آدمؑ روح اور جسم کے درمیان تھے"۔

خداوند تعالیٰ نے آپؐ کو اپنی تمام مخلوق سے ایک ہزار دہر قبل خلق فرمایا۔ کائنات کی ہر چیز نے آپؐ کی گواہی دی۔ پھر آپؐ کا نور خلق فرمایا اور عرش کے اردگرد طواف کرنے لگا تاکہ آپ کو عظمت پروردگار مزید حاصل ہو۔ آپؐ اپنے پروردگار کی قدرت کاملہ کا مطالعہ کریں۔ آپؐ کی یہ تخلیق آپؐ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اکرام و احترام تھا اس لیے آپؐ کی عظمت و جلالت کا مظاہرہ مقصود تھا کیونکہ آپؐ اس کے اہل تھے۔

ان اشراف کے دوران آپؐ اپنی عظیم الشان نبوت کی ضروریات کے لیے معارف الٰہیہ حاصل کرتے رہے کیونکہ آپؐ آخری نبیؐ تھے اور ختم نبوت والی منزلت عظیم ترین منزلت ہے۔ اس دوران آپؐ کی مختلف اطوار سے تربیت ہوتی رہی۔ خداوند تعالیٰ نے آپؐ کو لوح محفوظ کے کشف سے اپنے غیوب پر بھی مطلع فرمایا۔ اس دوران آپؐ کو قرآن کا علم بھی عطا کیا گیا۔ بعدازیں آپؐ کو اس دنیا میں اسی قرآن کی تبلیغ کا حکم دیا گیا۔ جب آپؐ پر جبرئیل امینؑ نازل ہوئے۔ ہمارے لیے اس حقیقت کی تفسیر کی گئی ہے۔ جب دوسری مرتبہ پیغمبر اکرمؐ پر قرآن کریم کے نزول کا سلسلہ

شروع ہوا تو جبرئیل امینؑ آپؐ پر قرآن کریم لاتے تو پہلے خود قرأت کرتے جناب جبرئیلؑ کو قرأت قرآن پر کیوں سبقت حاصل تھی اس لیے کہ وہ قرأت کی معرفت رکھتے تھے۔ خداوند تعالیٰ نے اپنے رسولؐ سے فرمایا:

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ

"اور آپؐ پر ہونے والی اس کی وحی کی تکمیل سے پہلے قرآن پڑھنے میں عجلت نہ کریں"۔ (سورۂ طٰہٰ: ۱۱۴)

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ○ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ○ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ (سورۂ قیامہ، آیہ ۱۶ تا۱۸)

"(اے نبیؐ) آپؐ وحی کو جلدی (حفظ) کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیں، پس جب ہم اُسے پڑھ چکیں تو پھر آپ بھی اس طرح پڑھا کریں"۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے آپؐ اس نزول قرآن سے قبل قرآن پر مطلع تھے کیونکہ، آپؐ کو لوحِ محفوظ کے ذریعے قرآن اور اس کا علم عطا کر دیا گیا تھا۔ یا اس کے علاوہ اس نزول سے قبل جناب جبرئیلؑ آپؐ کے پاس مکمل قرآن کے ساتھ نازل ہوئے تھے یا وحی الٰہی کے ذریعے آپؐ کے قلب مبارک پر قرآن کا نزول ہوا۔

جب خداوند تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ اب قرآن کریم کے ذریعے اس کے بندوں کی ہدایت کا سامان ہو تو پھر دوسری مرتبہ قرآن کا نزول ہوا۔ یہ پہلا نزول نہیں تھا بلکہ دوسرا تھا کیونکہ یہ نزول بندوں کے مصالح کے مطابق تھا۔ جس میں ان کی روحانی تربیت کا پروگرام تھا۔

نزول قرآن میں ہدایت کا سامان

خداوند تعالیٰ نے پسند فرمایا کہ قرآن کریم کا نزول ہو اور وہ اس کے بندوں کے لیے ذریعۂ نجات و ہدایت بنے تو اس امر کو روایات کے ذریعے ثابت کیا گیا ہے۔ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن کے نزول دو ہیں:

الف: سورہ کا مکمل نازل ہونا

روایات سے ثابت ہے کہ سورۂ مائدہ، الانعام، یونس، توبہ، الکہف اور سورہ آل عمران کی اسی آیات اور کچھ دوسری بلکہ اکثر قرآن کی سورتیں، سورہ سورہ کی صورت میں نازل ہوئیں سوائے دو یا تین سورتوں کے جیسے البقرہ اور آلِ عمران ہیں۔

خداوند تعالیٰ نے سورۂ نور کے اوّل میں فرمایا: سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا "ایک سورہ ہے جسے ہم نے نازل کیا اور فرض کیا"۔ اس طرح سورتیں نازل ہوئیں۔ اس کے ساتھ سورتوں کے نزول کے اسباب بھی بیان ہوئے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

> وَ اِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا (التوبہ:۱۲۴)
>
> "اور جب کوئی سورہ نازل ہوئی تو (ازراہِ تمسخر) کہتے ہیں کہ اس سورہ نے تم میں سے کس کے ایمان میں اضافہ کیا ہے"۔

جب آپ پر دو سورتوں یا تین سورتوں کی آیات نازل ہوتیں تو یہ تدریجاً ہوتا تھا۔ اس تدریج کا معنی یہ تھا کہ ایک سورہ نازل ہو رہی ہے چاہے اس کے نزول میں ایک ماہ لگا ہو، یا کچھ زیادہ یا کم، پھر دوسرے سورہ کے نزول کی ابتداء ہوتی۔ اس سے یہ مقصود نہیں تھا کہ ایک دفعہ ایک سورہ کی کچھ آیات نازل ہوں۔ پھر اس کے نزول کے دوران دوسری سورہ کی آیات نازل ہونے لگیں۔ روایات اس امر کی موید ہیں۔

صحابہ کرام سورہ کے ابتداء کو بھی جانتے تھے اور اس کی انتہا کو بھی اور پھر اس کے بعد آنے والی سورہ کے آغاز و انتہا کو بھی جانتے تھے۔ جب ایک سورہ کا آغاز ہوتا تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے آغاز ہوتا تھا۔

یہ تمام قرآنی سورتیں رسولؐ اللہ سے صحابہ حاصل کرتے اور انھیں اپنے اپنے مصاحف میں لکھتے اور حفظ کرتے اور اپنی نمازوں میں پڑھتے اور رسولؐ اللہ انھیں فرماتے کہ فلاں سورہ کا فلاں مقام پر پڑھنا مستحب ہے۔ اس طرح انھیں ان سورتوں کی قرأت کی کیفیات بتلاتے، ان کے اوقات اور حالات اور موارد کی تعلیم کرتے۔ وہ لوگ رسولؐ اللہ کے زمانے میں ان سورتوں کے اسماء سے واقف تھے۔ اس طرح دُور سے آنے والے لوگ واپس اپنے وطن ان سورتوں کو لے جاتے تھے اور وہاں کے لوگوں پر قرأت کرتے تھے۔ وہ لوگ کسی اضافی چیز کا انتظار نہیں کرتے تھے اور نہ ان سورہ کے متعلق سوالات کرتے تھے۔ اس طرح رسولؐ اللہ نے بھی ان مسافرین کی طرف ان کے پیچھے کوئی آدمی نہیں بھیجا کہ اب اس سورہ میں اضافہ ہو چکا ہے۔ جو کچھ وہ لے گئے تھے تو وہ مکمل لے گئے تھے۔

اگر تبدیل و تعدیل کا دروازہ کھلا رہا ہوتا تو اس کے شواہد ہمارے پاس ہوتے۔

ایک سورہ کا دو دفعہ نازل ہونا

بعض سورتیں ایسی بھی ہیں جو پہلی مرتبہ مکمل نازل ہوئیں لیکن پھر دوبارہ ان کو نازل کیا گیا۔ ان میں سورۂ اخلاص ہے۔ ایک دفعہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی دوبارہ مدینہ میں نازل ہوئی اور اس طرح سورہ الفاتحہ ہے۔ پہلی دفعہ مکہ میں اس وقت نازل ہوئی جب نماز فرض ہوئی اور دوسری مرتبہ مدینہ میں تحویلِ قبلہ کے وقت نازل ہوئی۔

(الاتقان، ج ا، ص ۳۵، الدر المنثور، ج ا، سورۂ فاتحہ کی تفسیر، ج ٦۔ فی تفسیر سورہ اخلاص

وشرح اصولِ کافی، ملا صالح مازندرانی، ج......، ص ۳۶۳۔ فتح الباری، ج ۸، ص ۱۲۱ و تحفۃ الاحوذی، ج ۸، ص ۲۲۸ و مجمع البیان، ج ۱، ص ۴۷۔ البیان السید الخوئی، ص ۲۱۸)

آیات کا دو مرتبہ نازل ہونا

بہت سی ایسی آیات ہیں جو ایک سے زیادہ مرتبہ نازل ہوئیں جیسا کہ سورۂ نحل کی آخری آیات سورۂ روم کی پہلی آیت روح اس طرح اللہ تعالیٰ کا قول ہے:

وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّهَارِ (ھود، آیہ ۱۱۴)

''اور نماز قائم کرو دن کے دونوں سروں میں''۔

یہ دونوں سورتیں ہود اور اسرا مکی سورتیں ہیں۔ ان دونوں کے نزول کا سبب بتاتا ہے کہ وہ دونوں عرفی ہیں۔

اس لیے سیوطی نے کہا: اس میں کوئی اشکال نہیں ہے کیونکہ وہ دو مرتبہ نازل ہوئیں۔ (الاتقان، ج ۱، ص ۳۵)

محدثین نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ یہ آیات ایک دفعہ نازل ہوئیں اپنے حقیقی سبب کے لیے پھر دوسری دفعہ جب نازل ہوئی تو ایک اور سبب کے لیے چند ایک مثالیں درج ذیل ہیں:

① اللہ تعالیٰ کا قول ہے: فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ (النحل: ۱۲۶) ''اور جب تم بدلہ لینا چاہو تو صرف اتنی ہی سزا دو جتنی تم پر زیادتی ہوئی ہے''۔ انھوں نے گمان کیا یہ کذب ہے حالانکہ یہ آیت آپؐ پر اس وقت نازل ہوئی جب حضرت حمزہؓ کا دشمنوں نے مثلہ کیا تھا تو آپؐ غضب ناک ہوئے تھے۔ آپؐ نے اپنے دشمنوں کو دھمکی دی تھی کہ میں ان کا ستر مرتبہ مثلہ کروں گا حالانکہ یہ رسول اللہؐ پر جھوٹ ہے۔ یہ آیت کسی انصاری کے لیے نازل ہوئی تھی۔ (الاتقان، ج ۱، ص ۳۳، الصحیح من السیرۃ النبیؐ، غزوۂ اُحد)

② یہ دوسری آیت ہے: مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ (سورۂ توبہ، آیہ ۱۱۳) "نبی اور ایمان والوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مشرکوں کے لیے مغفرت طلب کریں"۔

راویوں کا بیان ہے کہ جب رسولؐ اللہ نے حضرت ابوطالبؑ کے لیے استغفار فرمائی تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی یا محدثین نے کہا ہے کہ جب رسولؐ اللہ نے اپنے والدین کے لیے استغفار کیا تو یہ آیت نازل ہوئی حالانکہ یہ دونوں مورد کذب و افتراء پر مبنی ہیں۔

بعض راویوں کی روایت ہے کہ ایک ایسے آدمی کے لیے نازل ہوئی جس نے اپنے والدین کے لیے استغفار کیا تھا۔ ترمذی نے بھی یہی روایت کی ہے۔ (الصحیح من سیرۃ النبی الاعظم ایمان ابوطالبؑ)

③ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم دو مرتبہ نازل ہوئی: پہلی مرتبہ مکہ میں اور دوسری مرتبہ مدینہ میں۔ (تذکرۃ الخواص، ص ۳۰)

④ سبط ابن جوزی اور ان کے علاوہ دوسرے محدثین نے کہا ہے: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ دو مرتبہ نازل ہوئی۔ ایک عرفہ میں اور دوسری مرتبہ غدیر خم میں۔ (تذکرۃ الخواص، ص ۳۰ شرح اصول کافی، صالح مازندرانی، ج ۱۱، ص ۲۷۸)

⑤ تعالوا الی کلمة سواءٍ بیننا وبینکم دو مرتبہ نازل ہوئی۔ حافظ ابن حجر نے نقل کیا ہے۔ (تفسیر المیزان، ج ۵، ص ۲۶۷)

⑥ آیت اللعان دو مرتبہ نازل ہوئی۔ (لباب النقول، ص ۵)

⑦ آیت جزیہ بھی دو مرتبہ نازل ہوئی۔ جیسا کہ آیت روح اور سورۂ نحل کی آیات خواتیم دو مرتبہ نازل ہوئیں۔ (تفسیر القرآن ابن کثیر، ج ۱، ص ۳۳۹)

آیات کا نزول تدریجی

خداوند تعالیٰ نے اپنے قرآن کے اندر فرمایا کہ آیات قرآنی تدریجا نازل ہوئیں:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا (الفرقان:۳۲)

"کفار کہتے ہیں: اس (شخص) پر قرآن یکبارگی نازل کیوں نہ ہوا؟ (بات یہ ہے) کہ اس سے ہم آپؐ کے قلب کو تقویت دیں اور ہم نے اُسے بہترین تناسب اور عمدہ ترتیب کے ساتھ اُتارا ہے"۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَ قُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّ نَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ○ (بنی اسرائیل:۱۰۶)

"ہم نے قرآن کو جدا جدا نازل کیا تا کہ آپؐ اُسے ٹھہر ٹھہر کر لوگوں کو پڑھ کر سنائیں اور ہم نے اُسے بتدریج نازل کیا"۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید سورتوں کی شکل میں نازل ہوا اور پیغمبر اکرمؐ لوگوں پر ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس طرح ان سورتوں کو ایک دوسرے سے جدا جدا نازل فرمایا۔ قرآن جملہ واحدہ کی صورت میں نازل نہیں ہوا۔

روایات متواترہ سے ظاہر ہے کہ قرآن کی آیات بھی متفرق صورت میں نازل ہوئیں حالانکہ وہ پہلے اپنی سورت کے ضمن میں نازل ہو چکی تھیں۔ پھر کسی واقعہ کی مناسبت سے دوبارہ نازل کی گئیں۔ اس امر کے شواہد ملاحظہ فرمائیں۔

شواہد و دلائل

الف: سورہ الانعام جملہ واحدہ مکہ میں نازل ہوئی۔ ایک ہزار ملائکہ اس سورہ

کی مشائعیت میں آئے تھے۔ (درمنثور، ج ۳، ص ۲-۳۔ الاتقان، ج ۱، ص ۳۷۔ رواۃ: ابن ضریس، ابوعبیدہ، ابن المنذر، الطبرانی، ابن مردویہ، الحاکم، ابوالشیخ، البیہقی فی شعب الایمان وسلفی طیوریات میں وعبد بن حمید وغیرہ راوی ہیں: ابن عباس و ابن مسعود واسماء بنت یزید الضاویہ وابن عمر وانس وجابر وعن امام علیؑ وعن ابی بن کعب و مجاہد ومحمد بن المنکدر وعطا وغیرہ)

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سورتیں مختلف مناسبتوں سے نازل ہوئیں۔ چند ایک کا ذکر ہم ذیل میں کر رہے ہیں:

① ابن اسحاق سے روایت ہے کہ جب رسولؐ اللہ جا رہے تھے اور آپؐ کا گزر والید بن مغیرہ، اُمیہ بن خلف اور ابوجہل بن ہشام سے ہوا تو ان لوگوں نے آپؐ سے شدت کے ساتھ استہزاء کیا، مسخرہ کیا تو خداوند تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (الانبیاء:۴۱)

"اور بہ تحقیق آپ سے پہلے بھی رسولوں کا استہزاء ہوتا رہا مگر ان استہزا کرنے والوں کو اسی عذاب نے آگھیرا جس کا وہ استہزاء کرتے تھے"۔

② ابن اسحاق سے روایت ہے: جب رسولؐ اللہ نے اپنی قوم کے لیے اسلام کی دعا مانگی تو زمعہ بن اسود، نضر بن حارث وعبدہ بن عبدیغوث وابی بن خلف و عاص بن وائل نے آپؐ سے کہا: اے محمدؐ! آپؐ کے ساتھ ایک فرشتہ ہونا چاہیے جو لوگوں کو آپؐ کے بارے میں بتائے اور ان سے گفتگو کرے اور وہ آپؐ کے ساتھ دیکھا بھی جا سکے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے یہ آیت نازل فرمائی: قَالُوْا لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ (الانعام:۸)۔ (درمنثور، ج ۳، ص ۵۔ عن ابن منذر وابن ابی حاتم)

۲ حضرت امام علی علیہ السلام سے روایت ہے، آپؑ نے فرمایا: ابوجہل نے نبی اکرمؐ سے کہا: میں تمہیں نہیں جھٹلاتا بلکہ جو کچھ تو لایا ہے اُسے جھٹلاتا ہوں۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَ لٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (انعام:۳۳)

"یہ لوگ تمہیں نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے ہیں"۔ (درمنثور، ج ۳، ص ۹-۱۰۔ ترمذی و ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابی الشیخ الحاکم، والضیاء فی المختارہ و ابن مردویہ وعن ابی میسرہ۔ جس طرح کہ روایت کی ہے عبد بن حمید نے وابن منذر نے وابن مردویہ نے)

ابوصالح سے روایت ہے جب مشرکین نے رسول اللہؐ کو دیکھا تو بعض نے بعض سے کہا: ان کے درمیان کیا ہوا کیا وہ نبی ہے تو یہ آیت نازل ہوئی:

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ

"ہمیں علم ہے کہ ان کی باتیں یقیناً آپ کے لیے رنج کا باعث ہیں۔ پس یہ صرف آپؐ کی تکذیب نہیں کرتے"۔ (درمنثور، ج ۳، ص ۱۰، عن ابی الشیخ)

۳ ابن مسعود کہتے ہیں: ایک دفعہ قریشی سرداران کا پیغمبر اکرمؐ سے گزر ہوا تو اُس وقت آپؐ کی مجلس میں صہیب، عمار، بلال، خباب اور مثل ان کے غرباء و مساکین بیٹھے تھے۔ تو ان لوگوں نے آپؐ سے کہا: اے محمدؐ! کیا تو ان لوگوں سے خوش ہے؟ تو یہ آیت نازل ہوئی:

وَ اَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ

لَهُمْ مِّنْ دُوْنِہٖ وَلِیٌّ ....لَقُضِیَ الْاَمْرُ بَیْنِیْ وَ بَیْنَکُمْ وَ اللّٰہُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِیْنَ ○ (الانعام: ۵۱ تا ۵۸)۔ (درمنثور، ج ۳، ص ۱۲، عن احمد و ابن جریر و ابن ابی حاتم و الطبرسی و ابوشیخ و ابن مردویہ و ابی نعیم حلیہ میں)

ایک اور دوسری روایت ہے جس کے راوی عکرمہ ہیں۔ روایت کا خلاصہ یہ ہے: عتبہ و شیبہ و قرضہ بن عبد عمرو وغیرہ حضرت ابوطالبؑ کے پاس آئے۔ انھوں نے اپنا مطالبہ پیش کیا کہ محمدؐ اپنے اردگرد ان غرباء و مساکین کو اپنی مجلس سے اُٹھا دے تو اُس وقت حضرت عمر نے کہا: یارسولؐ اللہ! کیا میں ان لوگوں کو آپؐ کی محفل سے اُٹھا دوں؟ یہ سن کر یہ لوگ انتظار کرنے لگے کہ ابھی ان کا مطالبہ پورا ہونے والا ہے۔ تو اس امر پر یہ آیت نازل ہوئی:

وَ اَنْذِرْ بِہِ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْ یُّحْشَرُوْٓا اِلٰی رَبِّہِمْ لَیْسَ لَہُمْ مِّنْ دُوْنِہٖ ......الخ (الانعام:۵۱)

پھر آگے قریش کے ائمہ کفر اور ان کے حلیفوں کے بارے میں آیت نازل ہوئی:

وَ کَذٰلِکَ فَتَنَّا بَعْضَہُمْ بِبَعْضٍ لِّیَقُوْلُوْٓا ......الایۃ

جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت عمر نے اپنی بات سے معذرت کی۔ پھر خداوند تعالیٰ نے فرمایا:

وَ اِذَا جَآءَکَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ کَتَبَ رَبُّکُمْ عَلٰی نَفْسِہِ الرَّحْمَۃَ (الانعام:۵۴)

"جب تیرے پاس لوگ آئیں جو ہماری آیات پر ایمان لائے ہیں تو تم انھیں کہو تم پر سلامتی ہے۔ تمھارے پروردگار نے رحمت

کو اپنے اُوپر لازم قرار دیا ہے"۔ (درمنثور، ج ۳، ص ۱۳، عن ابن جریر، وابن المنذر)

۵ جناب خباب فرماتے ہیں: اقرع بن حابس اور عینیہ بن حصن آئے۔ ان لوگوں نے رسولؐ اللہ کو بلال، صہیب اور عمار کے پاس بیٹھا ہوا پایا۔ اس مجلس میں مَیں بھی تھا اور باقی غرباء و مساکین، مومنین بھی تھے۔ انھوں نے علیحدہ مجلس کا مطالبہ کیا جس میں یہ غرباء مومنین شامل نہ ہوں۔ آپؐ نے ان کا مطالبہ پورا کیا تو انھوں نے کہا: ہمارے لیے اسی امر (علیحدہ مجلس) کی تحریر لکھ دو تو آپؐ نے کاغذ طلب فرمایا اور حضرت علیؑ کو بلایا تاکہ وہ تحریر کر دیں اور اس وقت ہم ایک گوشے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ جناب جبرئیل امینؑ یہ آیت لے کر حاضر ہوئے: وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ سے فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ تو رسولؐ اللہ نے وہ کاغذ اپنے ہاتھ سے پھینک دیا اور ہمیں بلایا اور فرمایا: سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ۔ پھر ہم آپؐ کے پاس بیٹھ گئے پھر آپؐ اُٹھے اور ہمارے پاس سے چلے گئے تو خداوند تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ (الکہف:۲۸)

اُس نے کہا: رسولؐ اللہ ہمارے پاس بیٹھے، کچھ دیر بعد آپؐ اُٹھے اور ہم سے چلے گئے۔ تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے یہ آیت دوبارہ مدینہ میں نازل ہوئی۔ (درمنثور، ج ۳، ص ۱۳۔ ابن ابی شیبہ سے روایت ہے اس کے علاوہ راویوں کے یہ اسماء ہیں: ابویعلیٰ وابن ماجہ، ابونعیم حلیہ میں وابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم۔ ابوالشیخ وابن مردویہ، البیہقی دلائل ہیں)

ایک دوسری روایت ہے جس کے راوی عمر بن عبداللہ بن مہاجر ہیں۔ اکثر طور

پر نبی اکرمؐ جب نافلہ پڑھتے تو ستون توبہ کے پاس کھڑے ہوکر پڑھتے تھے۔ ایک دفعہ جب آپؐ نے صبح کی نماز پڑھی اور نوافل کے لیے ستون توبہ کی طرف تشریف لے گئے تو وہاں غرباء و مساکین و مسافر اور مولفۃ القلوب پہلے پہنچ چکے تھے۔ تو ان لوگوں نے آپؐ کو ہر طرف سے اپنے گھیرے میں لے لیا تو آپؐ نے ان پر اس آیت کی تلاوت فرمائی جو رات کو نازل ہوئی تھی۔ پھر ان سے گفتگو کی یہاں تک کہ سورج نے طلوع کیا تو اس دوران صاحبانِ دولت و ثروت آگئے تو انھوں نے اس منظر کو ناپسند کیا تھا تو آپؐ نے بھی ان کے اس رویے کو ناپسند کیا تو یہ آیت نازل ہوئی:

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم ...... الخ۔

جب یہ آیت ان کے بارے نازل ہوئی تو انھوں نے کہا: اگر آپؐ انھیں یہاں سے اٹھا دیں تو ہم تیرے ساتھی بھی ہوں گے بھائی بھی ہوں گے اور تجھ سے جدا نہیں ہوں گے۔ تو یہ آیت نازل ہوئی: وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ (الانعام:۵۲)۔ (درمنثور، ج ۳، ص ۱۳۔ اخبار مدینہ راوی زبیر بن بکار)

تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی اور سورۂ انعام مکمل طور پر مکہ میں اس سے قبل نازل ہو چکی تھی۔

سعد بن ابی وقاص کہتے ہیں: یہ آیت چھ کے بارے نازل ہوئی، ان میں سے ایک فرد میں تھا۔ دوسرے عبداللہ بن مسعود، بلال اور ہذیل قبیلے کا ایک فرد، دوسرے دو اور آدمی تھے۔ ان لوگوں نے کہا: یارسولؐ اللہ! ان لوگوں کو اپنی مجلس سے اٹھا دیں۔ پس ہمیں حیا آئی کہ ہم ان لوگوں کی اتباع کریں۔ پس رسولؐ اللہ کے دل میں وہی بات آئی جو اللہ چاہتا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ
يُرِيدُونَ وَجْهَهُ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِم مِّن شَيْءٍ وَمَا

مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○ وَ كَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْ بَيْنِنَا اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ○ (الانعام: ۵۲-۵۳)

"اور وہ لوگ جو صبح و شام اپنے رب سے دعا کرتے ہیں اور اُس کی خوشنودی چاہتے ہیں انھیں اپنے سے دُور نہ کریں اور نہ آپؐ پر ان کا کوئی بار حساب ہے اور نہ ہی ان پر آپؐ کا کوئی بار حساب ہے کہ آپؐ انھیں اپنے سے دُور کریں۔ پس اگر ایسا کیا تو آپؐ ظالموں میں سے ہو جائیں گے اور اس طرح ہم نے ان میں سے بعض کو بعض کے ذریعے یوں آزمائش میں ڈالا کہ وہ یہ کہہ دیں۔ کیا ہم میں سے یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے فضل و کرم کیا ہے۔ کیا اللہ اپنے شکر گزار بندوں کو بہتر نہیں جانتا ہے"۔ (درمنثور، ج ۳، ص ۱۳۔ رواۃ فریابی، عبد بن حمید و مسلم، نسائی، ابن ماجہ، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابن حبان وابوالشیخ وابن مردویہ، والحاکم، وابونعیم حلیہ میں اور دلائل میں البیہقی)

یہاں اور بھی بہت سی روایات ہیں۔ (درمنثور، ج ۳، ص ۱۳-۱۴۔ مجاہد اور ربیع بن انس سے روایت ہے: انھوں نے ابن عساکر سے، عبد بن حمید سے ابن ابی حاتم سے، ابوشیخ وابن ابی شیبہ وابن المنذر وابن جریر سے روایت کی ہے)

۶ ماہان سے روایت ہے اُس نے کہا: کچھ لوگ پیغمبر اکرمؐ کی مجلس میں آئے اور عرض کیا: ہم نے بہت زیادہ گناہ کیے ہیں۔ آپ سُن کر خاموش رہے۔ وہ چلے گئے تو یہ آیت نازل ہوئی: وَ اِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا ...... الخ۔ پس آپؐ

نے انھیں بلایا اور ان پر اس آیت کی تلاوت فرمائی۔ (درمنثور، ج ۳، ص ۱۴۔ رواۃ فریابی، عبد بن حمید، مسعود نے مسند میں، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابوالشیخ)

۷ زید بن اسلم سے روایت ہے اُس نے کہا: جب یہ آیت نازل ہوئی: قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا (الانعام:۶۵) ''تم کہہ دو کہ وہ اس پر قادر ہے کہ کوئی عذاب یا تو اُوپر کی طرف سے تم پر نازل کر دے''۔ تو رسول اللہؐ نے فرمایا: میرے بعد کافر نہ ہو جانا ورنہ تمھارے بعض اپنی تلواروں سے تمھارے بعض کی گردنوں کو کاٹیں گے۔ تو صحابہ نے سن کر عرض کیا: ہم تو گواہی دیتے ہیں اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپؐ اللہ کے رسول ہیں؟ پھر بھی ایسا ہوگا۔ آپؐ نے فرمایا: جی ہاں۔

بعض لوگوں نے کہا: ایسا نہیں ہوگا تو خداوند تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ○ وَ كَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَ هُوَ الْحَقُّ (الانعام: ۶۵-۶۶) ''دیکھو ہم کس طرح کی آیات کو کس طرح ان کے لیے واضح کرتے ہیں۔ شاید وہ سمجھ لیں تیری قوم نے اس کی تکذیب کی اور انکار کیا حالانکہ وہ حق ہے۔ (درمنثور، ج ۳، ص ۲۰، عن ابن جریر و ابن منذر)

۳ ابن جریج سے روایت ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے: ایک دفعہ مشرکین پیغمبر اکرمؐ کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جب انھوں نے آپ سے قرآن سنا تو استہزاء کرنے لگے تو اُس وقت یہ آیت نازل ہوئی: وَ اِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ (الانعام:۶۸) جس وقت تم ان لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیات کا مذاق اُڑاتے ہیں تو ان سے منہ پھیر لو۔ جب وہ آپؐ کا مذاق اُڑانے لگے تو آپؐ کھڑے ہو گئے۔ پھر وہ استہزاء کرنے سے رُک گئے اور کہنے لگے: استہزاء مت کرو کہ وہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ آپؐ نے خیال فرمایا شاید کہ وہ راہِ راست پر آ جائیں اس

لیے فرمایا: لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ تو یہ آیت نازل ہوئی: فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ○ وَ مَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ (الانعام: ۶۸-۶۹) ''تو جونہی اس ستم گر گروہ کی طرف تمھاری توجہ ہو جائے تو ان کے پاس بیٹھنے سے کنارہ کشی کر لو''۔

اگر صاحب تقویٰ افراد انھیں ہدایت اور پند و نصیحت کرنے کے لیے ان کے پاس بیٹھ جائیں تو ان کے حساب میں سے کوئی چیز ان کے اُوپر عائد نہیں ہوگی لیکن یہ کام صرف انھیں یاد دہانی کرانے کے لیے ہونا چاہیے شاید وہ سنیں اور پرہیزگاری اختیار کر لیں۔

۹ جناب ابن عباسؓ سے روایت ہے، یہودیوں نے کہا: اے محمدؐ! کیا اللہ نے تجھ پر کتاب نازل فرمائی ہے؟ آپؐ نے فرمایا: جی ہاں۔ تو انھوں نے کہا: اللہ کی قسم! اللہ نے آسمان سے کوئی کتاب نازل نہیں کی۔ آپؐ نے فرمایا: پھر یہ بتاؤ جس کتاب کے ساتھ جناب موسیٰؑ آئے تھے اس کو کس نے نازل کیا تھا؟ تو یہ بات واضح ہے یہ یہود کے ساتھ احتجاج مدینہ میں ہے اور پیغمبرؐ مدینہ میں بعد از ہجرت تشریف لائے تھے تو یہ آیت اسی مناسبت سے نازل ہوئی۔ اس آیت کا نزول دلیل ہے کہ یہ آیت دوبارہ نازل ہوئی حالانکہ پہلے سورہ کے ضمن میں نازل ہو چکی تھی۔

۱۰ ایک دوسری روایت میں ہے: سعید بن جبیر کہتے ہیں: یہ مالک بن صیف کے حق میں نازل ہوئی۔ جب رسولؐ اللہ نے اُس سے پوچھا: کیا تورات میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ ''حبر سمین'' پر غضب ناک ہوتا ہے؟ یہ سن کر وہ غصے میں آ گیا کیونکہ وہ خود حبر سمین[1] تھا۔ انکار کر دیا اور کہا: اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر بھی کوئی کتاب نازل نہیں کی۔ تو اُس کے اپنے ساتھیوں نے کہا: تجھ پر افسوس ہے کیا جناب موسیٰؑ پر بھی

---

۱ حبر، حبر یہودیوں کا عالم ''سمین'' بھاری بھرکم، موٹا تازہ۔

نازل کی گئی؟ تو اس نے کہا: ہاں اللہ نے کسی بشر پر کوئی کتاب نازل نہیں کی تو پھر یہ آیت نازل ہوئی: وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ (الانعام:۹۱)۔ (درمنثور، ج ۳، ص ۲۹، عن ابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم)

⑪ محمد بن کعب قرظی کہتے ہیں: یہودیوں کی ایک جماعت پیغمبر اکرمؐ کے حضور آئی اور کہا: اگر تم اللہ کے پیغمبرؐ ہو تو اپنی آسمانی کتاب ایک ہی دفعہ ہمارے سامنے پیش کرو جیسا کہ موسیٰؑ تورات کو اکٹھا لے کر آئے تھے۔ تو یہ آیت نازل ہوئی: يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ (النساء:۱۵۳) "اہلِ کتاب تم سے تقاضا کرتے ہیں کہ (ایک ہی مرتبہ) آسمان سے ایک کتاب ان پر نازل کر دو"۔

ایک یہودی نے آپؐ سے کہا: کوئی چیز اللہ نے تم پر نازل نہیں کی اور نہ موسیٰؑ پر اور نہ عیسیٰؑ پر اور نہ کسی اور پر۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ (درمنثور، ج ۳، ص ۲۹، عن ابن جریر)

ایک اور روایت بھی ہے جس کے راوی محمد بن کعب ہیں: تو اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ تمام مناقشات جو یہودیوں کے ساتھ ہوئے وہ مدینہ میں ہوئے نہ کہ مکہ میں۔ (درمنثور، ج ۳، ص ۲۹، ابی الشیخ)

⑫ یہ آیت جو نازل ہوئی: وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَ لَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّ مَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (انعام:۹۳) "اور اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ، بہتان باندھے یا یہ دعویٰ کرے کہ مجھ پر وحی ہوئی ہے حالانکہ اس پر کوئی وحی نازل نہیں ہوئی اور جو یہ کہے کہ جیسا اللہ نے نازل کیا ہے ویسا میں بھی نازل کر سکتا ہوں"۔

یہ آیت سعد بن سرح کے بارے نازل ہوئی کیونکہ یہ آدمی رسول اللہؐ کے لیے

قرآن لکھتا تھا۔ پھر یہ مکہ بھاگ نکلا تھا جب لوگوں نے اس سے پوچھا تو اس نے کہا: وہ جس طرح چاہتا تھا، لکھتا تھا۔ (درمنثور، ج ۳، ص ۷ ۳، عن الحاکم، مستدرک میں عن ابن ابی حاتم عن شرحبیل بنی سعد وعن السدی)

اور ایک روایت میں ہے یہ سورہ مسیلمہ کذاب کے بارے نازل میں ہوئی۔

اس طرح کی اور بہت سی مثالیں ہیں۔ آیات کا نزول مدینہ میں ہوا حالانکہ وہ آیات سورتوں کے ضمن میں پہلے مکہ میں نازل ہو چکی تھیں۔

⑫ وَ لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ (انعام:۱۰۸) "اور اللہ کے علاوہ جنھیں یہ پکارتے ہیں انھیں بُرا نہ کہو مبادا وہ نادانی و عداوت کی صورت میں اللہ کو بُرا کہنے لگیں"۔ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب قریش جناب ابوطالبؑ کے پاس گئے اور آپؑ کے بھتیجے کے بارے میں گفتگو کی۔ انھوں نے اپنا مطالبہ پیش کیا۔ آپ انھیں روکیں کہ وہ ان کے بتوں کی شماتت نہ کرے ورنہ وہ بھی شماتت کریں گے۔ (درمنثور، ج ۳، ص ۳۸ عن ابن ابی حاتم)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ آیت کی ایک خاص نسبت ہے جس کی وجہ سے اس کا نزول ضروری ہوا۔ اس طرح سورہ کے ضمن میں اس کا نزول ہو چکا تھا پھر دوبارہ ہوا۔

⑬ محدثین نے بتایا ہے یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب مشرکین نے آپؐ سے مطالبہ کیا تھا کہ کوہ صفا سونا بن جائے۔

وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ مَا يُشْعِرُكُمْ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ وَ نُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَ اَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ نَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ○ وَ لَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَ كَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَ حَشَرْنَا

عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ○ (انعام:۱۰۹ تا ۱۱۱)

''اور یہ لوگ اللہ کی پکی قسمیں کھا کر کہتے ہیں اگر ان کے پاس کوئی معجزہ آئے تو یہ اس پر ضرور ایمان لائیں گے۔ کہہ دیجیے اللہ کے پاس یقیناً معجزے بہت ہیں لیکن (مسلمانو) تمہیں کیا معلوم کہ معجزے آ بھی جائیں تب بھی یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے اور ہم ان کے دل و نگاہ کو اس طرح پھیر دیں گے جس طرح یہ پہلی مرتبہ ان پر ایمان نہیں لائے تھے اور ہم انھیں ان کی سرکشی میں سرگرداں چھوڑے رکھیں گے اور اگر ہم ان پر فرشتے بھی نازل کر دیں اور مُردے بھی ان سے باتیں کرنے لگیں اور ہر چیز کو ہم ان کے سامنے جمع کر دیں تب بھی یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ہاں اگر اللہ چاہے (تو اور بات ہے) لیکن ان میں سے اکثر لوگ جہالت میں ہیں''۔

⑮ جناب ابن عباسؓ سے روایت ہے: یہودی حضرت رسولؐ اللہ کے پاس آئے اور کہا: ہم اپنا ذبیحہ کھاتے ہیں اگر اس حیوان کو اللہ مار دے تو پھر اُسے نہیں کھاتے، اس کی کیا وجہ ہے؟ تو یہ آیت نازل ہوئی:

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ○ وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ ○ وَلَا

تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَ اِنَّهٗ لَفِسْقٌ وَ اِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ وَ اِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ○ (انعام: ۱۱۸ تا ۱۲۱)

"اور کیا وجہ ہے کہ تم وہ (ذبیحہ) نہیں کھاتے جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہے؟ حالانکہ اللہ نے جن چیزوں کو اضطراری حالت کے سوا تم پر حرام قرار دیا ہے، ان کی تفصیل اس نے تمہیں بتا دی ہے اور بے شک اکثر لوگ اپنی خواہشات کی بنا پر نادانی میں گمراہ ہوتے ہیں۔ آپ کا اب حد سے تجاوز کرنے والوں کو یقیناً خوب جانتا ہے اور تم ظاہری اور پوشیدہ گناہوں کو ترک کر دو۔ جو لوگ گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں بے شک وہ عنقریب اپنے کیے کی سزا پائیں گے اور جس ذبیحہ پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا اُسے مت کھاؤ کیونکہ یہ سنگین گناہ ہے اور شیاطین اپنے دوستوں کے دلوں میں یقیناً شکوک پیدا کرتے ہیں تاکہ وہ تم سے بحث کریں۔ اگر آپ نے ان کی اطاعت کی. تو آپ بھی مشرک بن جائیں گے"۔

(درمنثور، ج ۳، ص ۴۱، ۴۲۔ اس روایت کے راوی یہ ہیں: ابوداؤد، ترمذی، البزاز، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابوالشیخ، ابن مردویہ، فریابی، ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابوداؤد، ابن ماجہ، الحاکم، نحاس، طبرانی، بیہقی۔ ایک دوسری روایت میں ج ۳، ص ۴۲ راوی ضحاک ہیں۔ ابوالشیخ نے بھی روایت کی اس کے علاوہ عبد بن حمید، طبرانی، ابن مردویہ اور ابوداؤد ہیں)۔

اس مضمون پر اور بھی بہت سی روایات موجود ہیں۔ (درمنثور، ج ۳، ص ۴۲)

⑲ ابن جریج نے کہا: إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ (انعام: ۱۴۱) ثابت بن قیس بن شماس کے بارے میں نازل ہوئی۔ ہماری مراد اس سے یہ ہے کہ یہ مدینہ میں نازل ہوئی۔ اس آیت کا یہ دوسرا نزول ہے۔ اس سے پہلے سورہ میں نازل ہو چکی تھی۔
(درمنثور، ج ۳، ص ۴۹، عن ابن جریر، ابن ابی حاتم)

سورہ کہف

یہ سورہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ انھوں نے کہا: رسولؐ اللہ نے فرمایا: سورۂ کہف مکمل طور پر مکہ میں نازل ہوئی۔ جب نازل ہوئی تو اس کے ساتھ ستر ہزار ملائکہ نازل ہوئے۔ (درمنثور، ج ۴، ص ۲۱۰، مسند الفردوسی دیلمی، راویان: ابن مردویہ، نحاس الاتقان، ج ۱، ص ۳۷-۳۸)

ان لوگوں نے روایت کی ہے کہ قریش مکہ نے یہود مدینہ کی طرف نضر بن حارث و عقبہ بن معیط کو بھیجا تا کہ حضرت محمدؐ کے بارے میں وہ کچھ رہبری کریں، کیا یہ نبیؐ ہیں یا نہیں؟ تو یہودیوں نے انھیں کہا: یہ تین سوالات ان کے سامنے رکھو اگر تو وہ جواب دے دیں تو سمجھنا وہ نبیؐ ہے۔ وہ سوالات اصحاب کہف، ذوالقرنین اور روح کے بارے تھے۔ پس وہ لوگ واپس مکہ آئے اور پیغمبر اکرمؐ کے سامنے وہ سوالات رکھے تو جبرئیل امینؑ پندرہ دنوں کے بعد سورۂ کہف کے ساتھ تشریف لائے۔
(درمنثور، ج ۴، ص ۲۵۰۔ راویان: ابونعیم، بیہقی و ابن اسحاق و ابن جریر و ابن المنذر)

سورہ کہف جملۃً واحدۃً نازل ہوئی۔ اس کی اکثر آیات مختلف مناسبات کی صورت میں نازل ہوئیں۔ اب بطور مثال ہم اس کا ذکر کرتے ہیں:

① ابن مردویہ اور ابونعیم میں اپنے حلیہ اور بیہقی نے شعب ایمانی میں سلمان سے روایت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ

وَ لَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ○ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَ لَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَ اتَّبَعَ هَوٰهُ وَ كَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ○ وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا (سورۂ کہف: ۲۷-۲۸)

"اے محمدؐ! اپنے آپ کو ان لوگوں کی معیت میں محدود رکھیں جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اور اس کی خوشنودی چاہتے ہیں اور اپنی نگاہیں ان سے نہ پھیریں۔ کیا آپؐ دنیاوی زندگی کی آرائش کے خواہش مند ہیں؟ اور آپؐ اس شخص کی اطاعت نہ کریں جس کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر دیا ہے اور جو اپنی خواہشات کی پیروی کرتا ہے اور اس کا یہ معاملہ حد سے گزرا ہوا ہے اور کہہ دیجیے کہ یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے حق ہے۔ پس جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے، ہم نے ظالموں کے لیے یقیناً ایسی آگ تیار کر رکھی ہے"۔

جب یہ سورہ نازل ہوئی تو اس وقت مؤلفۃ القلوب پیغمبرؐ کی مجلس میں آ گئے۔ ان میں سے ایک عیینہ بن بدر اور دوسرے اقرع بن حابس تھے۔ (اس مجلس کے غرباء) کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے:

اے محمدؐ! اگر تو کسی محفل میں صدر نشین ہو اور ایسے افراد (کہ جن کی بدبو انسانی مشام کو اذیت پہنچاتی ہے اور جنھوں نے موٹے کھردرے اُونی لباس پہن رکھے ہیں (ان کی مراد سلمانؓ و ابوذرؓ تھے) اپنے سے دُور کر دے (یعنی مجلس میں اشراف اور

بڑے بڑے لوگ بیٹھے ہوں) تو ہم تیرے پاس آئیں گے اور تیری مجلس میں بیٹھیں گے اور تیری باتوں سے فائدہ اٹھائیں گے) لیکن کیا کریں ان کے ہوتے ہوئے تو ہم یہاں نہیں بیٹھ سکتے۔ اُس وقت یہ آیات نازل ہوئیں۔

ایک دوسری روایت میں آیا ہے جس کے راوی جناب سلیمان فارسی ہیں۔ آپ نے کہا: یہ آیت میرے اور ایک دوسرے آدمی کے بارے میں نازل ہوئی۔ جب اُس نے مجھے حقارت سے دیکھا اور میری تحقیر کی اور کہنے لگا: اے محمدؐ! جب ہم آپ کی مجلس میں آئیں تو اس کو اپنی مجلس سے باہر نکال دیا کرو۔ جب ہم واپس چلے جائیں تو واپس بلا لیا کریں۔ جب وہ باہر نکلا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ ...... الخ (درمنثور، ج ۴، ص ۲۱۹، عن عبد بن حمید)

تو یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ جناب سلیمانؓ مدینہ میں اسلام لائے تھے تو یہ آیات مدینہ میں دوبارہ نازل ہوئیں حالانکہ اس سے قبل نازل ہو چکی تھی۔

۲ محدثین نے روایت کی ہے: اللہ تعالیٰ کا یہ قول وَ لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا (الکہف:۲۸) اُمیہ بن خلف کے بارے میں نازل ہوئی۔ جب اُس نے کہا: اے محمدؐ! ان فقراء کو اپنے سے دُور کر، تاکہ صناوید مکہ آپؐ کی مجلس میں آسکیں۔ (درمنثور، ج ۴، ص ۲۲۰، عن ابن مردویہ)

۳ وَ لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا کے بارے میں بھی کہا گیا ہے کہ یہ آیت عیینہ بن حصن کے بارے میں نازل ہوئی۔ ابھی تک اس نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ اُس نے کہا تھا مجھے سلمان فارسیؓ کے کپڑوں کی بُو سے تکلیف ہوتی ہے۔ الخ۔

حاصلِ کلام یہ ہے، آیت خاص مناسبت سے نازل ہوئی، حالانکہ اس واقعہ خاص سے سورہ کے ضمن میں نازل ہو چکی تھی۔ عیینہ بن حصن کا قصہ مدینہ کا قصہ ہے اور سورہ دفعۃً واحدہ مکہ میں نازل ہو چکی تھی۔ (درمنثور، ج ۴، ص ۲۲۰)

④ سدی نے کہا: یہودیوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: آپ ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور دوسرے انبیاءؑ کا ذکر کرتے رہتے ہیں کیونکہ ان کے تذکرے آپؐ ہم سے سن چکے ہیں۔ تو ہمارے سامنے اُس نبی کا ذکر کر جس کا ذکر توراۃ میں نہیں ہوا۔ سوائے صرف ایک مقام کے۔ آپؐ نے فرمایا: وہ کون ہیں؟ انھوں نے کہا: وہ ذوالقرنین ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ان کے بارے میں مجھ تک کوئی بات نہیں پہنچی۔ وہ سن کر خوش خوش باہر چلے آئے۔ اپنے آپ سمجھ رہے تھے کہ وہ نبی کو مغلوب کر کے آ رہے ہیں۔ ابھی گھر کے دروازے تک نہ پہنچے تھے کہ جناب جبرئیل امینؑ نازل ہوئے اور ان کے پاس یہ آیات تھیں:

وَ يَسْئَلُوْنَكَ عَنْ ذِى الْقَرْنَيْنِ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا (الکہف، آیہ ۸۳)

"اور تم سے ذوالقرنین کے بارے سوال کرتے ہیں تو کہہ دے عنقریب میں تم پر ان کا ذکر کروں گا"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات خاص واقعہ کی مناسبت سے نازل ہوئیں۔ سورۂ کہف کے حوالے سے پیغمبر اکرمؐ پر اس واقعہ سے قبل ان آیات کے نزول کا ذکر نہیں ہوا تھا۔ (درمنثور، ج ۴، ص ۲۴۰، راوی ابن ابی حاتم)

⑤ مجاہد نے ایک روایت کی ہے: ایک مسلمان نماز پڑھتا تھا یا روزہ رکھتا تھا یا صدقہ دیتا تھا اس نیت سے کہ لوگوں میں اس کی اچھی شہرت ہو۔ لوگ اُسے اچھا کہیں تو یہ آیت نازل ہوئی: فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ (الکہف: ۱۱۰)۔ (درمنثور، ج ۴، ص ۲۵۵، رواہ: ابن منذر وابو نعیم وابن عساکر واسد الغابہ، ج ۱، ص ۳۰۳)

مجاہد نے ایک روایت کی ہے کہ مسلمانوں میں ایک آدمی تھا جو جہاد میں شریک ہوتا۔ اس نیت سے کہ لوگوں میں اس کا مقام بن جائے تو یہ آیت نازل ہوئی:

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَاءَ رَبِّهِ (درمنثور، ج ۴، ص ۲۵۵، عن ابن ابی حاتم)

یہ آیت ایک خاص واقعہ کے لیے نازل ہوئی، حالانکہ یہ سورہ اس آیت سمیت مکہ میں دفعۃً واحدہ نازل ہوئی تھی۔

بحث کا خلاصہ یہ ہے: اللہ تعالیٰ نے پہلے سورہ نازل فرمائی اور وہی مکمل سورہ نبی کریمؐ نے لوگوں پر قرأت فرمائی۔ پھر واقعات کے مطابق آیات نازل ہوئیں۔ لوگوں کو ان آیات کے اسباب نزول کا علم ہوا۔ معلوم ہوا یہ قرآن کریم اُس ذات نے نازل فرمایا ہے جو عالم الغیب والشہادہ ہے۔

اور کچھ وہ سورتیں جو تدریجاً نازل ہوئیں جیسا کہ سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران ہیں۔ ان کا نزول تدریجی بھی سیاست الٰہیہ ہے۔ یہ روایات بھی موجود ہیں کہ سورہ آل عمران کی اسی اور اسی سے کچھ اُوپر آیات دفعۃً واحدہ نازل ہوئیں۔

بقیہ آیات احداث کے مطابق پے درپے نازل ہوتی رہیں۔ جبرئیل امینؑ پیش آنے والے واقعات سے مربوط آیات کے ساتھ نازل ہوتے رہے حالانکہ یہ آیات پہلے نازل ہو چکی تھیں۔

یہی حال سورۂ مائدہ کا ہے۔ یہ دفعۃً واحدہ نازل ہوئی۔ پھر اس کی آیات تدریجاً نازل ہوتی رہیں۔ جب کوئی واقعہ درپیش ہوتا تو اس کی مطابقت میں آیات نازل ہوتی رہیں۔

آیت اکمال الدین کا آیت تبلیغ رسالت سے قبل آنا سیاست الٰہیہ کا حصّہ تھا۔ اس سے حفاظت قرآن مقصود تھی۔ امرِ ہدایت کو آسان بنانا مقصود تھا۔

❋......❋......❋

چوتھا حصّہ

امام اور امامت

کیا امام علی علیہ السلام کی امامت کے بغیر دین مکمل ہے؟

سوال آپ اس بارے کیا فرمائیں گے کہ رسول اکرمؐ کے برنامۂ رسالت میں امامت اسی برنامہ کا حصّہ تھی لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس برنامۂ امامت کو عملاً مکمل نہ کیا (یعنی اپنے بعد اپنے قائم مقام کا اعلان نہیں فرمایا) تو رسولؐ اللہ کے وصال کے بعد مسلمانوں نے اپنا امیر بنایا، جو امام علیؑ کے علاوہ تھا۔ تو اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ رسولؐ اللہ نے جو برنامہ بنایا تھا وہ دین کے علاوہ تھا، جناب کی کیا رائے ہے؟

۱) دین کی تعریف کیا ہے؟

۲) کیا امامت دین کا جز ہے؟ یعنی امامت رسولؐ اللہ کے برنامہ کا حصّہ تھا؟ یا یہاں ان دونوں کے درمیان کوئی منافات پائی جاتی ہے؟

جواب اس بات میں تو کوئی شک ہی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم فرمایا کہ امیر المومنینؑ کی ولایت و امامت کا اعلان کریں۔ غدیر کے دن اور اس کے علاوہ کئی بہت سے مقامات اور اوقات میں آپؑ کی ولایت کی تبلیغ فرمائی۔ امام علیؑ کی ولایت دینِ اسلام کا جز ہے۔ آپؑ کی ولایت سے مربوط آیات جو غدیر میں نازل

ہوئیں اس امر پر شاہد ہیں۔ ان آیات کو ملاحظہ فرمائیں وہ یہ ہیں:

① اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا:

یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَ اللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ ○ (المائدہ:۶۷)

"اے رسولؐ! جو کچھ آپؐ کے پروردگار کی طرف سے آپؐ پر نازل کیا گیا ہے اُسے پہنچا دیجیے اور اگر آپؐ نے ایسا نہ کیا تو گویا آپؐ نے اللہ کا پیغام نہیں پہنچایا اور اللہ آپؐ کو لوگوں (کے شر) سے محفوظ رکھے گا۔ بے شک اللہ کافروں کی رہنمائی نہیں کرتا"۔

① یہ آیت ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اس آیت کو جو تبلیغِ ولایت کا پیغام رکھتی ہے اگر اس کو نہیں پہنچایا تو ایسے ہے جیسے دینِ اسلام کا کوئی کام نہیں کیا۔ اس اعتبار سے حضرت امام علی علیہ السلام کی ولایت کے اعلان سے دینِ اسلام کا برنامہ مکمل ہوتا ہے۔ اگر اس ولایت کو ایک طرف رکھ دیا جائے تو وہ برنامہ مکمل ہی نہیں ہوتا جس کے لیے اتنی سعی کی گئی ہے۔ آیت کا پہلا حصہ اسی امر پر دال ہے کہ اگر امام علی علیہ السلام کی ولایت کی تبلیغ نہ کی گئی تو ایسے ہے کہ تحریکِ رسالت کا کوئی کام ہوا ہی نہیں۔

② اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے آخر میں فرمایا: اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ "بے شک اللہ کافروں کی رہنمائی نہیں کرتا"۔ کیونکہ یہ وہ لوگ تھے جو ولایت علیؑ پر راضی نہ تھے اور جو ولایتِ علیؑ کو تسلیم نہ کرے تو وہ کافر ہے۔ وہ کیوں کافر ہے؟ اس لیے کہ وہ دین کے حقائق کا انکاری ہے۔ کیونکہ امام علی علیہ السلام کی ولایت دینِ اسلام کا ایک مکمل برنامہ ہے اور ان کی ولایت کا انکار حسد کی وجہ سے ہو یا خواہشاتِ نفس کی وجہ سے ہو، ہر اعتبار سے ان کی ولایت واجب ہے۔

۴ تیسری بات یہ ہے: آیت کا مضمون بتاتا ہے کہ عدم ابلاغ ولایت عدم ابلاغ رسالت کلی ہے۔ تو اس سے یہ معلوم ہوا اعمال اس وقت قبول ہوتے ہیں جب ولایت علیؑ کو تسلیم کیا جائے۔ اگر ولایت امام علیؑ پر ایمان نہیں تو اعمال قبول نہیں ہوتے۔ کوئی آدمی ساری رات اللہ کی بندگی کرے، دن کو روزے رکھے اور ہر سال حج کرے۔ وہ امام علیؑ کی ولایت پر ایمان نہیں رکھتا تو ان تمام عبادات کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ آپ کی ولایت پر ایمان رکھنے سے عقیدۂ توحید مکمل ہوتا ہے۔ اگر امام علیؑ کی ولایت پر ایمان نہیں تو پھر خداوند تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان نہیں۔ جس طرح حضرت امام رضا علیہ السلام نے اپنے آباؤ اجداد سے حدیث نقل فرمائی ہے۔ رسولؐ اللہ پر جناب جبرئیلؑ نازل ہوئے اور انھوں نے بارگاہِ رسالت میں عرض کیا: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

> کلمة لا اله الا الله حصنی ، فمن دخل حصنی امن من عذابی کلمه لا اله الا الله
>
> ''کلمہ لا الٰہ الا اللہ میرا قلعہ ہے جو اس میں داخل ہوا تو وہ میرے عذاب سے محفوظ ہوگیا۔ پھر آپؐ نے فرمایا: بِشُرُوطِهَا۔ اپنی شرائط کے ساتھ وَاَنَا مِن شُرُوطِهَا اور ان شرطوں میں سے ایک شرط میں ہوں''۔ (الحیاۃ السیاسیہ للامام رضاؑ، ص ۱۴۵)

ایک دوسری روایت ہے:

> ولایت علی ابن ابی طالب حصنی فمن دخل حصنی امن من عذابی ''ولایت علی ابن ابی طالبؑ میرا قلعہ ہے جو اس میں داخل ہوا وہ میرے عذاب سے محفوظ ہوگیا''۔

ان دونوں حدیثوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ ان دونوں سے مراد توحید ہے اور توحید کیا ہے وہ ولایت امام علیؑ ہے جو اللہ تعالیٰ کا قلعہ ہے۔

خداوند تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ (المائدہ:٦٧)

"اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو رسالت کو نہیں پہنچایا"۔

آیت کا یہ حصّہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ حقائق اسلام اور شریعت اور اُس کے احکام ایک انسانی جسم کی مانند ہیں۔ ایسا جسم جس کی ساخت مکمل ہوچکی ہو اور ہر اعتبار سے کامل ہو لیکن ابھی روح نہ ڈالی گئی ہو۔ اب یہ جسم جسم تو ہے لیکن بے حس و بے حرکت ہے۔ جب اس میں روح آئے گی تو یہ جسم بیدار ہوگا۔ اس میں حرکت آئے گی۔ ہاتھ اپنا کام کرتا دکھائی دے گا۔ آنکھ اپنا کام دل اور باقی تمام اعضاء اپنے اپنے کام میں مصروفِ عمل ہوں گے۔

ولایت امام علی علیہ السلام روح کی مانند ہے جو دینِ اسلام کے جسدِ مبارک کو قائم رکھتی ہے اور اس کے تمام قوانین اور احکام کے لیے حیات ہے اور ان کا نفاذ ہے اور انسان کو ان احکام پر چلا کر اللہ تک لے جاتی ہے۔ اگر رسولؐ اللہ اس ولایت کی تبلیغ نہ فرماتے تو ایسے تھا جیسے انھوں نے رسالت کا کوئی کام کیا ہی نہیں۔ رسولؐ اللہ کے تمام ابلاغات بے فائدہ ہوجاتے۔ نہ اس میں روح ہوتی اور نہ حرکت وحیات۔

۳ دوسری آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ:۳) "آج کے دن میں نے تمہارا دین مکمل کیا اور اپنی نعمت تمام کی اور میں نے تمہارے لیے دینِ اسلام کو پسند کیا"۔

یہ آیت مبارکہ یومِ غدیر میں ولایت امام علیؑ کے لیے نازل ہوئی تھی:

الف: پہلی بات تو یہ ہے کہ ولایت علیؑ دین کا حصّہ ہے۔ اس کے بغیر دین مکمل نہیں ہوتا۔

ب: دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو وہ دین پسند ہی نہیں جس میں امام علیؑ

کی ولایت نہ ہو۔ اب بات یہ ہے کہ امام علی علیہ السلام کو عملاً و فعلاً اس برنامہ میں ہونا چاہیے۔ بعداز رسولؐ اللہ وہ عملاً حاکم ہوں۔ تب جا کر رضائے الٰہی اس کے دین کے ساتھ مربوط ہوگی حالانکہ آپؑ کو ظاہری حکومت فوراً بعداز رسولؐ اللہ نہیں مل سکی تو اس اعتبار سے رضائے پروردگار اس دین کے ساتھ مربوط نہیں ہوگی؟

اس کا جواب یہ ہے: رضائے پروردگار کا معنی اعلانِ ولایت ہے۔ جب اعلانِ ولایت ہوگیا تو دین مکمل ہوگیا۔ جب دین مکمل ہوگیا تو ایسے دین کو اللہ نے پسند کرلیا۔ میں مزید عرض کروں گا: اس امر کو تمام دنیا جانتی ہے۔ حضرت امام علی علیہ السلام کو اس مرکز سے دُور کر دیا گیا تھا جس مرکز کے آپؑ اہل تھے۔ کیا اب اس صورت میں دینِ اسلام کے لیے رضائے الٰہی باقی رہ جائے گی، ختم ہو جائے گی؟ اس بات میں کوئی شک نہیں ہے اللہ کی رضا باقی ہے کیونکہ ابلاغِ ولایت ہوگیا ہے۔ جب ابلاغِ ولایت ہوگیا ہے تو اکمالِ دین ہوگیا ہے۔ جب اکمالِ دین ہوگیا ہے تو رضائے الٰہی حاصل ہوگئی ہے۔ یہاں یہ بات نہیں ہے کہ لوگ اطاعت کریں یا مخالفت کریں (امام علیؑ کو حاکم مانیں یا نہ مانیں)۔

۞ اسلام کے لیے رضائے پروردگار صرف اور صرف یہی ابلاغِ ولایت تھا۔ اس کے ذریعے دین مکمل ہوگیا ہے۔ اس آیت سے صرف اور صرف ابلاغِ ولایت تھا نہ کہ یہ عملی برنامہ تھا جیسا کہ ظاہر ہے۔ اسی کے ساتھ دین اپنے آخری نکتے پر پہنچ گیا۔ اب بعداز رسولؐ اللہ خدائی پروگرام پر عمل کریں یا اس کو پسِ پشت ڈالیں اس سے امامؑ کی ولایت متاثر ہوگئی ہے اور رضائے پروردگار جو اس کے دین سے مربوط ہے، وہ بے اثر ہوتی ہے۔

جیسا کہ بعض لوگوں کا نظریہ ہے۔ آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ امام علیؑ کے یومِ غدیر علم نصب کرنے سے قبل نازل ہو چکی تھی اور رسولؐ اللہ نے یومِ غدیر

اپنی رسالت کا ابلاغ فرمایا تو یہ دونوں آیات ایک دوسرے کے منافی ہیں۔ جو پہلے آنے والی تھی وہ بعد میں آئی اور بعد والی پہلے نازل ہوئی۔ اس سے وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ امام علی علیہ السلام کوئی ایسی شخصیت نہ تھے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کی تخلیق سے قبل چنا ہو۔ مزید وضاحت کے لیے ان کا مقصد یہ ہے کہ یہ امر خلافت امام علی علیہ السلام پر منحصر نہیں تھا۔ ان کے علاوہ کوئی دوسرا آدمی اس امر کے لیے کافی تھا۔ اس کے ذریعہ عملی برنامہ پایۂ تکمیل تک پہنچ جاتا۔ ہاں اگر سب لوگوں کا کسی ایک پر اجماع ہو جاتا اور اُسے امام علیؑ کی جگہ نصب کر دیتے تو کام بن جاتا۔ اسی اعتبار سے بعض لوگوں کے قول کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ ان کا کہنا تھا: بعداز رسولؐ مسلمانوں پر لازم تھا کہ وہ مسلمانوں میں کسی کو رسولؐ اللہ کا قائم مقام بنا دیں۔

یہ سب قیل وقال شیعہ مذہب کے خلاف ہیں۔ شیعہ اہلِ بیتؑ جو کہتے ہیں وہ ادلہ قاطعہ اور براہین ساطعہ قرآن اور سنتِ شریفہ سے ثابت ہے۔ اب سوال یہ کہ دین اور برنامہ عملی کے درمیان کیا فرق ہے؟ اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے۔ یہ امر بالکل واضح ہے کہ دین احکام اور شرائع کے مجموعہ کا نام ہے۔ جو لوگوں سے انہی پر ایمان اور عمل کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ قیامت تک اس پر عمل پیرا رہیں۔ برنامہ عملی سے مراد یہ ہے کہ ایسا ماحول پیدا کیا جائے جس میں عوام الناس ان حقائق کو قبول کریں اور ان پر ایمان لائیں اور عمل کریں۔ یہ امر نہ تو جعل کا محتاج ہے اور نہ تشریع کا بلکہ وہ جہد بشری کا نتیجہ ہے۔ برابر ہے کہ وہ نافذ العمل ہو یا نہ ہو۔ اس صورت میں الٰہی مداخلت علی سبیل معونیت ہے نہ سبیل جعلی و تشریعی۔ اس تمام بحث کے بعد دین اسی امر کا نام ہے اللہ کی طرف رجوع کیا جائے اور انسان کی انتہا اسی ذات پر ہو۔

بیعت

سوال بعداز رسولؐ اللہ سقیفہ کے معاملے میں آپ کیا فرمائیں

گے؟ غدیر میں ایک لاکھ بیس ہزار آدمیوں نے امام علی علیہ السلام کی بیعت کی لیکن وصالِ رسولؐ اللہ پر حالات کس طرح معطل ہوئے؟

جواب جہاں تک بات ہے ایک لاکھ بیس ہزار افراد جنھوں نے غدیر میں رسالتؐ اللہ کے سامنے امام علی علیہ السلام کی بیعت کی تھی ان کی کثرت وصالِ رسولؐ کے موقع پر مدینہ میں موجود نہ تھی۔ یہ سب اپنے گھروں کی طرف چلے گئے تھے۔ جو انقلاب کے خواہاں تھے انھیں اس بات کی ضرورت نہ تھی کہ وہ ان شہروں میں جائیں اور جدید حالت سے آگاہی دیں۔ انھیں اس امر کی ضرورت تھی کہ جو رسولؐ اللہ چاہتے تھے وہ نہ ہونے پائے۔

مدینہ اس وقت ایک چھوٹا سا قریہ تھا۔ جس کی کمل آبادی تقریباً دو ہزار یا تین ہزار تھی۔ جس میں ہر صنف کے آدمی تھے۔ چھوٹے بھی تھے، بڑے بھی تھے۔ مرد بھی تھے، عورتیں بھی تھیں۔ تمام اصناف کے کل بالغ لوگ ملا کر زیادہ سے زیادہ ایک ہزار کے لگ بھگ ہوں گے۔

اس وقت کی مدینہ کی آبادی کی طرف اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا: میں جو بات اسلام کے بارے میں کہوں اس کو لکھ لیا کرو۔

حذیفہ بن یمان کہتے ہیں: اُس وقت لکھنے والوں کی تعداد پندرہ سو تھی۔ ایک اور روایت کے مطابق کہا گیا ہے: ہم سولہ صد اور سترہ صد کے درمیان تھے اور جن لوگوں نے شجرہ کے نیچے بیعت کی تھی وہ چودہ یا پندرہ سو تھے۔ ایک قول ہے کہ وہ اٹھارہ سو تھے۔ ان میں مہاجرین بھی تھے جن کی تعداد سیکڑوں میں تھی۔ اس کے علاوہ مدینہ کے بالکل قریب رہنے والے قبائل کے لوگ تھے جو اس تعداد میں شامل ہیں۔

ان تین آدمیوں نے اہلِ سقیفہ کو "اوّل" کی بیعت پر مجبور نہیں کیا تھا بلکہ

"پہلے" نے اوس وخزرج کے درمیان زمانۂ جاہلیت کی باتوں سے اختلاف پیدا کر دیا۔ پھر وہ پوشیدہ کینے آمنے سامنے آگئے۔ بعض کو ڈرایا دھمکایا گیا۔ آخرکار اس کے ساتھی نے اس کی بیعت کرلی۔ پھر ابوعبیدہ نے بیعت کی۔ ان کے بعد اُسید بن حضیر نے بیعت کی۔ نوبت آٹھ آدمیوں تک جا پہنچی۔ جس طرح کہ روایات اس مضمون پر موجود ہیں۔

جب اوس وخزرج نے انھیں سقیفہ میں چھوڑا؟ جناب امیرالمومنینؑ کے خانۂ اقدس پر حاضر ہوئے تاکہ ان کی بیعت کریں۔ اس سے قبل کہ بات باہر چلی جائے۔ جب یہ لوگ آئے تو انھوں نے سقیفہ کی رپورٹ دی۔ پھر جناب سیدہ زہراؑ اور ان لوگوں کے درمیان گفتگو ہوئی۔

پھر قبیلہ بنواسلم کو اس مقصد کے لیے تیار کرلیا گیا اور انھوں نے لوگوں سے جبراً بیعت لینا شروع کر دی۔ اس خوف و ہراس کی وجہ سے لوگوں نے پہلے کی بیعت کی۔ لیکن بنوہاشم نے اس کی بیعت نہ کی۔ ان کے علاوہ بہت سے اور لوگ بھی تھے جنھوں نے بیعت نہ کی۔ امام علیؑ کا پہلا سیاسی حریف امام علی اور اہلِ بیتؑ سے سخت کینہ رکھتا تھا۔ اس نے ان لوگوں کے ساتھ قیام کیا۔ اوس وخزرج کو اپنی بیعت پر مجبور کیا۔ اس چیز کو پالیا جو اُسے سقیفہ میں نہ ملی تھی۔ یہ امر اُسے دوسرے دن حاصل ہوا جب قبیلہ بنواسلم کے ہزاروں لوگوں نے اس کا ساتھ دیا۔

کیا رسولؐ اللہ حضرت علی علیہ السلام کے لیے وصیت کرنا چاہتے تھے؟

سوال شیعہ دعویٰ کرتے ہیں حضرت رسولؐ اللہ اپنی مرضِ موت میں حضرت امام علی علیہ السلام کے لیے وصیت لکھنا چاہتے تھے لیکن اس کام میں ایک شخص رکاوٹ بنا اور اُس نے کہا: (آپؐ) ہذیان کہہ رہے ہیں یا ان پر درد کا غلبہ ہو رہا ہے یا ایسے

الفاظ استعمال کیے جن کا مفہوم یہی تھا۔ اس کے علاوہ حدیث
ہے ہی نہیں کہ حضرت رسولؐ اللہ نے چاہا تھا کہ امام علی علیہ السلام
کی خلافت کی تحریر لکھیں۔ بس شیعوں کو غیب سے اوامر ملتے ہیں
جن کی بنا پر اس طرح کی باتیں بناتے ہیں۔ وہ خواہ مخواہ
امر امامت کو ثابت کرنا چاہتے ہیں حالانکہ ان کے پاس دلیل بھی
نہیں ہے۔ اس لیے ان کی حجت اس طریقے سے باطل ہے۔ کیا
اس سوال کا کوئی جواب ہے تو تحریر فرمائیں؟

جواب اس سوال کے ساتھ شیعہ خیر البریہ کے موقف امامت کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ اس سوال کے جواب کے لیے درج ذیل توضیحات ملاحظہ کریں:

① دوسرے خلیفہ کو معلوم تھا کہ رسولِ اکرمؐ اپنے مرضِ موت میں کاغذ، قلم لے کر امام علی علیہ السلام کی امامت کی تصریح فرمائیں گے۔ جس کی وجہ سے انھوں نے حاضرین کو منع کر دیا تھا کہ (وہ ہذیان میں ہیں) اس واقعہ کو اہلِ سنت نے اپنی کتب میں روایت کیا ہے۔ (شرح نہج البلاغہ معتزلی، ج ۱۲، ص ۲۱، الرجال، ج ۶، عبداللہ بن عباس)

② اگر ہم فرض کرلیں کہ پیغمبرؐ کا امام علی علیہ السلام کی امامت کو لکھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لیکن اُس کے اس قول میں تو یقین ہے کہ اُس نے کہا: ان النبی یھجر او غلبه الوجع...... "نبی کریمؐ کو ہذیان ہوا ہے یا درد کا غلبہ ہے یا اس مفہوم کے قریب الفاظ ادا کیے تھے"۔

صاحب کے اس قول میں کوئی شک والی بات ہے ہی نہیں۔

جی ہاں! ایسے الفاظ بارگاہِ رسالت میں ادا کرنا ایک بہت بڑی جسارت ہے۔ عزت وعظمت پیغمبرؐ کے منافی الفاظ اور ان کے حضور کہنا آپ اس کو کیا کہیں گے؟

اس شخص کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہوگی؟ ایسے شخص کی امامت وخلافت کے اثبات و بطلان کے لیے یہی الفاظ کافی ہیں جو شخص پیغمبر اکرمؐ کی شان میں ایسے الفاظ کہے جو ان کے مقام ومراتب کے خلاف ہوں۔ ایسا آدمی ان کا جانشین نہیں بن سکتا۔ ان الفاظ کے علاوہ اور کچھ بھی ہمارے پاس ان کے خلاف نہ ہو لیکن یہی الفاظ مکمل کفایت کرتے ہیں۔ آپ ان کی حکومت کو حکومت کہہ سکتے ہیں خلافت نہیں کہہ سکتے۔ اس کے علاوہ انھوں نے یہ الفاظ ادا کیے۔ لیکن کہیں نہیں ملتا کہ انھوں نے شانِ رسالتؐ میں جو کچھ کہا اُس پر توبہ کی ہو۔ بلکہ ان کی اس جرأت میں نبیؐ کے وصال کے بعد اور اضافہ ہوا۔ انھوں نے رسولؐ اللہ کی بیٹی حضرت زہراؑ کے گھر کے دروازہ پر ہجوم کیا (اور جو کچھ کیا وہ کتب میں موجود ہے)۔ جس کے بارے میں اللہ کے رسولؐ نے فرمایا تھا: مَنْ اَغْضَبَهَا اَغْضَبَنِي ''جس نے اُسے غضب ناک کیا اس نے مجھے غضب ناک کیا''۔ اس کے علاوہ اس موضوع پر اور بہت سی احادیث ہیں۔

۳ تیسری بات یہ ہے کہ رسولؐ اللہ نے لکھنا ترک کر دیا تھا۔ آپؐ نے عبداللہ بن عمرو بن عاص کو حکم دیا:

اُكْتُبْ فَوَاللّٰهِ لَا يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ هَاتَيْنِ اِلَّا حَقٌّ

''جو کچھ میرے ہونٹوں سے صادر ہو اُس کو لکھ لیا کرو۔ قسم بخدا جو کچھ ان سے صادر ہوتا ہے وہ حق ہے''۔

آپؐ نے ان لوگوں کو حکم دیا:

قَيِّدُوا الْعِلْمَ بِالْكِتَابِ

''علم کو لکھ کر اپنا قیدی بنا لو''۔

حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کو آپؐ نے علمِ جفر والجامعہ املا کروایا۔ اس کے علاوہ دوسرے علوم املا کروائے۔ ہم نے اس موضوع کو اپنی کتاب ''الصحیح من

سیرت النبی الاعظمؐ" میں تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔

④ چوتھی بات یہ ہے کہ اگر ہم فرض کرلیں کہ پیغمبرِ اسلام نے زندگی بھر کچھ نہیں لکھا اور اپنی زندگی کے آخری لمحات میں آپؐ نے ارادہ فرمایا کہ ایک ضروری امر کو خود تحریر فرمائیں تو اس بات پر کیا اشکال ہوسکتا ہے؟ بس صرف قیاس سے کام لیا جائے۔ جب آپؐ نے زندگی میں کچھ نہیں لکھا تو اب ان لمحات میں آپؐ نے لکھنے کی کوئی بات نہیں کی اور پیغمبرؐ پر یہی حکم نافذ کردیں۔

⑤ پانچویں بات کیا وہ پیغمبرؐ کو ایک تحریر لکھنے سے منع کرنے کا حق رکھتے تھے۔ پھر انھیں یہ حق کہاں سے حاصل ہوا تھا کہ وہ کہیں: ان النبی یھجر کہ پیغمبرؐ کو ہذیان ہوا ہے یا ان پر درد کا غلبہ ہے یا ایسے الفاظ جن کا مفہوم یہی تھا۔

⑥ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرما دیا تھا کہ میں ایک ایسی تحریر لکھ دوں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہوں گے تو اُس شخص کو حسبنا کتاب اللہ کا نعرہ مارنے کا کیا حق تھا؟ کیا وہ نبی اکرمؐ سے اُعرف تھا؟ اُسے زیادہ علم تھا کہ ہدایت و گمراہی کا علاج کیا ہے؟ جب پیغمبرِ اکرم نے فرما دیا تھا: لن تضلوا بعدی...... میرے اس لکھنے کے بعد تم گمراہ نہیں ہوں گے۔ حالانکہ وہی قرآن نبیؐ پر ہی اُترا تھا۔ اس قرآن کی موجودگی میں آپؐ نے یہ فرمان جاری کیا تھا تو قرآن کی موجودگی میں اس کتاب کی ضرورت تھی۔ جس کو پیغمبرؐ آخری لمحات میں لکھنا چاہتے تھے؟ یہ کتاب نبی کریمؐ کی ایک تدبیر تھی، جو تنفیذی اور اجرائی تدبیرؐ تھی۔ اور وہ کتاب لوگوں کو ان دعووں سے روک دینے والی تھی جس کے وہ اہل نہیں تھے۔ قرآن کریم تو اصول و معانی اور قواعد و ضوابط بیان کرتا ہے۔ اس کی تفسیر و تشریح پیغمبرؐ نے فرمائی۔

⑦ ہم آخر میں یہی کچھ عرض کریں۔ ایسا آدمی جس نے پیغمبر اکرمؐ پر اتنی جرأت کی تھی تو کیا ایسا آدمی، اُس نبی کی بیٹی اور ان کے شوہر پر جرأت نہیں کرسکتا تھا۔

ہاں جرأت کی تھی اور کئی گنا زیادہ کی تھی۔

امام علیؑ نے اپنی اولاد کے نام اُن لوگوں کے مثل کیوں رکھے؟

سوال امام علیؑ نے اپنی اولاد کے نام اُن لوگوں کے مثل کیوں رکھے؟ کیا آپؑ کو ان سے محبت تھی؟ جب محبت تھی تو پھر شیعہ اپنے دعوئی میں جھوٹے ہیں۔ پھر ان کی یہ بات بھی غلط ہے کہ انھوں نے ان کے گھر پر ہجوم کیا اور حقوق غصب کیے۔

جواب آپ کے سوال کا جواب یہ ہے:

① یہ کوئی قانون قاعدہ نہیں ہے کہ ایک آدمی اپنے بیٹے کا نام کسی کے نام پر رکھے تو اُس سے سمجھا جائے کہ اس کو اُس سے محبت تھی۔ اس بنا پر اُس نے اپنے بیٹے کا نام اُس کے نام پر رکھا۔ ہاں جب تک دلائل سے ثابت نہ ہو جائے۔ ہاں جب ثابت ہو جائے کہ فلاں کو فلاں سے محبت تھی اس بنا پر اُس نے اپنے بیٹے کا نام اس کے نام پر رکھا۔ یا پھر ہمیں علام الغیوب اس امر پر مطلع کرے۔

② یہ تسمیت باسم مّا کسی سے محبت کی دلیل نہیں ہے۔ اگر ایسا نام اس صورت میں رکھا بھی گیا ہو تو اشخاص اور ان کے حالات کے اعتبار سے اسباب مختلف ہوتے ہیں۔

③ ہمیں ان اسماء سے نفرت نہیں۔ تاریخ اسلام میں بہت سے ایسے صدر اسلام کے لوگ تھے جن کے نام یہی تھے اور وہ لوگ نبیؐ کے اہلِ بیتؑ سے محبت کرتے تھے۔ جیسے حضرت عمر بن ابی سلمہ جو رسولؐ اللہ کے ربیب تھے اور امامؑ کی معیت میں جنگ جمل میں شہید ہوئے تھے۔ آپؑ نے انھیں بحرین اور فارس کا عامل مقرر کیا تھا۔ امامؑ کے نزدیک وہ ایک ثقہ فرد تھے۔ آپ ان سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے اور اس طرح باقی اسماء کا بھی یہی حال ہے۔ (اصابہ عسقلانی و اسد الغابہ، الاستیعاب ابو عمر بن عبد البر وغیرہ)

④ امام علی علیہ السلام نے اپنے بیٹے عثمان کی وجہ تسمیہ بیان فرمائی تھی، میں نے ان کا نام اپنے برادر عثمان بن مظعون کے نام پر رکھا ہے۔(قاموس الرجال، ج۶،ص ۲۸۷، ابوالفرج)

جو نام "پہلے کا ہے" ایسا نام آپؑ نے اپنے کسی بیٹے کا نہیں رکھا۔ یہ آپؑ کے اُس بیٹے کی کنیت ہے اور جو "دوسرے" کے نام کی بات ہے۔ وہ ہم نے ذکر کر دی ہے۔ آپؑ نے اپنے اس صحابی کی محبت میں رکھا جو جنگ جمل میں شہید ہوئے تھے۔

⑤ اکثر دیکھنے میں یہ بھی آیا ہے جو عورتوں کے ہاں بیٹے بیٹیاں پیدا ہوتی ہیں تو وہ اپنی اولاد کے نام ان ناموں پر تجویز کرتی ہیں جن سے انھیں محبت ہوتی ہے جیسا کہ باپ کا نام، دادا کا نام، بھائی کا نام وغیرہ وغیرہ شاید آپؑ کی بعض اولاد کے اسماء اس نسبت سے رکھے گئے ہوں۔

ان تمام صورتوں میں جو جس سبب کا دعویٰ کرتا ہے وہ اپنے اس دعویٰ کی دلیل پیش کرے۔

حضرت امام علیؑ اور دوسرے خلیفہ کے درمیان کوئی نزاع نہیں تھا

سوال جب امام علی علیہ السلام اور ان کے مقابل آنے والے حضرات کے مناقشات پر بحث ہوتی ہے تو ان کے پیروکاران ہمارے سامنے عقد اُم کلثوم کی حجت پیش کرتے ہیں۔ اگر امام علی علیہ السلام اور دوسرے خلیفہ کے درمیان کوئی ایسے معاملات ہوتے تو امام علیؑ اپنی بیٹی جناب اُم کلثومؑ کا عقد اُن کے ساتھ نہ کرتے۔ اگر اُس صاحب نے سیدہ زہراؑ کے گھر کا دروازہ پر ہجوم کیا ہوتا اور ان کو ضربات لگائی ہوتیں اور ان کے جنین کے سقط کا سبب بنتا تو سیدہ زہراؑ کی بیٹی کا اُس کے ساتھ عقد نہ کیا

جاتا۔ اس تزویج سے ان کی والدہ کی روح کو تکلیف پہنچی ہوگی اور بیٹی کے لیے بھی اذیت کا باعث ہے۔ کیا ان لوگوں کا یہ استدلال صحیح ہے؟

جواب اس کلام سے استدلال صحیح نہیں ہے اور اس مسئلہ کی طرف توجہ کی ضرورت ہے:

۱ تزویج کے کچھ اسباب و حالات ہوتے ہیں اور ان اسباب کی بنیادیں میلان و رغبت، پیار و محبت، تعلق و علاقہ ہوتے ہیں۔ کبھی ضرورت بھی سبب بنتا ہے۔ یہ ازدواجی تعلقات کبھی تو رضامندی سے ہوتے ہیں اور کبھی جبر و اکراہ سے بھی ہوتے ہیں۔ یہ تو ناممکن ہے کہ اُم کلثوم کا عقد حضرت عمر سے میل و رغبت کی بنا پر ہوا ہو۔

۲ یہاں کئی ایک تصریحات میں اُس صاحب نے اس تزویج کے لیے جبر و اکراہ کا راستہ بھی اختیار کیا ہو، حالانکہ وہ نبی کریمؐ کے بارے کہہ چکا تھا کہ انھیں ہذیان ہوگیا ہے۔ حضرت سیدہ زہراءؑ کے دروازے پر ہجوم کیا، انھیں زخمی کیا، ان کا جنین سقط ہوا۔

۳ عقد اُم کلثومؑ بن علی بن ابی طالبؑ کی بات نہیں، یہ اُم کلثوم جن کا عقد حضرت عمر سے ہوا تھا وہ حضرت ابوبکر کی صاحبزادی تھیں۔ حضرت عائشہ کی وساطت سے یہ رشتہ ہوا تھا۔

اگر کوئی قول حضرت علیؑ کی شہزادی حضرت اُم کلثومؑ کے بارے میں ہے تو وہ قول صحت سے بہت دُور ہے۔ کیونکہ شیعہ کتب میں کوئی ایسی روایت موجود نہیں ہے۔ اس قول کے راوی صرف اہلِ سنت ہیں۔ ان لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ اپنے رہبر کی طرف جھوٹ کی نسبت دیں۔ اس سے ان کے رہبر کا کیا فائدہ ہے یا ان کو اس سے کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

عالمِ انوار میں علم آئمہ طاہرینؑ

سوال جب آئمہ طاہرینؑ عالمِ انوار میں تھے اور ان کے انوار عرشِ خداوندی کا طواف کر رہے تھے کیا وہ اس وقت بھی عالم تھے؟

جواب اس عالمِ انوار کے بارے ہم وہی کچھ جانتے ہیں جو ہمیں روایات سے بلا ہے۔ اس کے علاوہ ہم کچھ نہیں جانتے۔ اس امر میں کوئی شک نہیں ہے۔ جب خداوند تعالیٰ نے انھیں تخلیق فرمایا تو انھیں وہ استعداد عطا فرمائی جس استعداد کی بنیاد پر عطایا الٰہیہ کی انھیں معرفت حاصل ہوئی ہے۔ جو بارگاہِ خداوندی میں ان کے حوائج کی قبولیت ہے۔ ان کے احوال و ضروریات کے مطابق علوم و معارف عطا فرمائے۔ خداوند تعالیٰ نے انھیں اپنی تمام مخلوقات پر فضیلت عطا فرمائی کیونکہ انھوں نے ہر چیز کی تخلیق سے پہلے خداوند تعالیٰ کی شہادت دی۔ جیسا کہ روایات میں ہے۔ وہ بے پناہ لطف الٰہی میں رہے۔ یہی لطف ربانی اور فیوضات الٰہیہ جو انھیں حاصل تھا، ان کی استعداد کی دلیل میں وہ ہر طرح سے کامل اور اکمل ہیں۔ یہ تکامل کے آخری نکتے پر ہیں۔ خداوند تعالیٰ سے دُعا ہے ہمیں ان کی شفاعت نصیب فرمائے اور انھی کے ساتھ محشور فرمائے کیونکہ وہ ذات قادرِ مطلق ہے۔

دورِ مہدیؑ اور جناب خضرؑ

سوال جب اس زمانے میں ایک نبی جناب خضرؑ موجود ہیں تو پھر امام مہدیؑ کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ نبی کی موجودگی میں امامؑ کی ضرورت نہیں رہتی؟ وضاحت فرمائیں۔

جواب احادیث میں وارد ہے کہ حضرت خضرؑ زندہ ہیں۔ وہ اس وقت فوت ہوں گے جب صُور پھونکا جائے گا یا چیخ بلند ہوگی۔

حضرت امام رضا علیہ السلام فرماتے ہیں: اہلِ سنت کی روایات میں ہے:

انھیں اس لیے زندہ رکھا گیا ہے تاکہ دجال کی تکذیب کریں (جب دجال آئے تو آپؑ ظاہر ہو کر دنیا کو بتا دیں کہ وہ جھوٹا ہے)۔ (در منثور، ج ۴، ص ۲۳۹ میں ہے۔ جناب خضرؑ سمندر میں ہیں اور جناب الیاسؑ خشکی پر ہیں)

ایک روایت جو کعب سے مروی ہے کہ جناب خضرؑ سمندری مخلوق کو حکم دیتے ہیں۔ وہ آپؑ کا حکم سن کر اطاعت کرتے ہیں۔ صبح و شام ارواح ان کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ جناب خضرؑ نے جناب موسیٰؑ سے کہا: میں ایسے امر پر موکل ہوں جس کی آپؑ طاقت نہیں رکھتے اور آپؑ ایسے امر پر موکل ہیں جس کی میں طاقت نہیں رکھتا۔

آپؑ نے یہ بھی فرمایا: میرے پاس علم ہے جس کا سیکھنا آپؑ کے لیے ضروری نہیں اور آپؑ کے پاس علم اُس کا سیکھنا میرے لیے ضروری نہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب خضرؑ کا دور جناب موسیٰؑ کے دور سے مختلف تھا۔ اب ان کا دور ہے کہ غیبت امامؑ کے زمانے میں آپ ایک مانوس ماحول پیدا کریں۔ اس کے علاوہ ان کے اور بھی کام ہیں جیسا کہ روایات میں آیا ہے۔

یہ دعویٰ غلط ہے کہ جناب خضرؑ کی موجودگی امام مہدیؑ کے دور کو باطل کر رہی ہے اور یہ بھی نہیں ہے کہ امام مہدیؑ کا وجود ان کے دور کو باطل کرتا ہے۔ اگر اس نظریہ کو تسلیم کریں تو پھر جناب امیرالمومنین علی ابن ابی طالبؑ کے دور کو یا باقی آئمہؑ کے ادوار کو باطل ماننا پڑے گا کیونکہ وہ تو ان کے زمانے سے پہلے میں اور آج تک زندہ ہیں۔ اس کے علاوہ روایات میں ہے کہ جناب عیسیٰؑ نازل ہوں گے اور امام مہدیؑ کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھیں گے۔

❋......❋......❋

پانچواں حصّہ

عصمت

جنابِ خضرؑ اور جنابِ موسیٰؑ

سوال قرآن کریم میں آیا ہے: حضرت موسیٰؑ نے فرمایا: لَا تُؤَاخِذْنِیْ بِمَا نَسِیْتُ (الکہف:۷۳) "مجھ سے جو بھول ہوئی ہے اس پر آپ میرا مواخذہ نہ کریں"۔ کیا نبیؑ کو نسیان ہو سکتا ہے؟

جنابِ موسیٰؑ کے جناب یوشعؑ بن نون ساتھی تھے۔ وہ نبیؑ بھی تھے ان پر شیطان کیسے مسلط ہو گیا تھا جس کی وجہ سے مچھلی کا واقعہ انھیں بھول گیا تھا؟

حضرت خضرؑ نے بچے کو کیوں قتل کیا تھا، حالانکہ اس بچے سے کسی جرم کا ارتکاب نہیں ہوا تھا؟ کیا جنایت سے قبل قصاص جائز ہے؟ اگر یہاں ایک بچے کو صرف اس لیے قتل کر دیا جاتا ہے کہ اس کے والدین کا ایمان محفوظ رہے تو پھر حضرت امیر المومنین امام علیؑ نے اپنے قاتل عبدالرحمٰن بن ملجم کو کیوں قتل نہ کیا حالانکہ آپؑ کو معلوم تھا کہ وہ عنقریب آپؑ کو قتل کر دے گا؟ حضرت امیر علیہ السلام کے قتل میں تو اُمت کا بہت بڑا نقصان ہوا تھا۔ حضرت امیر المومنینؑ نے جب اپنے قاتل پر اپنے اصحاب کو آگاہ کیا تھا

تو انھوں نے قتل کی بات کی تھی۔ آپ نے فرمایا: جنایت سے قبل
قصاص نہیں ہے۔

جواب پہلے سوال کا جواب یہ ہے: جناب موسیٰؑ نے فرمایا: لَا تُؤَاخِذْنِیْ بِمَا نَسِیْتُ کیا ایک نبیؑ کو نسیان ہو سکتا ہے؟ آیاتِ مقدسہ کی روشنی میں غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اپنے بیان کے آغاز سے قبل اپنے محترم برادر کی توجہ درج ذیل امور کی طرف مبذول کرنا چاہتے ہیں:

① روایات میں ہے وہ نوجوان جو جناب موسیٰؑ کے ساتھ تھے وہ آپؑ کے وصی تھے جن کا اسمِ گرامی یوشعؑ بن نون بتایا گیا ہے۔

② اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا تھا کہ وہ جائیں اور عبدِ صالح سے ملاقات کریں۔ وہ عبدِ صالح جنابِ خضرؑ تھے جو اللہ کے نبیؑ تھے۔ روایات میں یہی وارد ہے۔ آیت کا ظاہر جنابِ موسیٰؑ کے لیے ہے اور مچھلی کے معاملے میں ہے۔ جہاں وہ رہے اُس مچھلی نے بحر میں ایک عجیب صورت میں راستہ بنایا تھا اور جنابِ یوشعؑ کو نسیان ہوا کہ وہ قصہ جنابِ موسیٰؑ کو بتائیں۔ اس مچھلی کا زندہ ہونا اور پانی میں چلے جانا علامت تھا کہ وہ عبدِ صالحؑ اسی مقام پر موجود ہیں۔

③ اللہ تعالیٰ نے عبدِ صالح جنابِ خضرؑ کو طولانی عمر کا رزق عطا فرمایا ہے۔ وہ صور پھونکے جانے تک زندہ رہیں گے۔ صور پھونکے جانے پر ان پر موت آئے گی۔ روایات میں یہی کچھ ہے۔

④ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس عبد کو اپنی طرف سے ایک خاص رحمت عطا کی تھی۔ انھیں علمِ لدنی بھی عطا کیا تھا۔ ان کا علمِ وہبی تھا، کسبی نہ تھا۔ علمِ وہبی فکر و سعی سے حاصل نہیں ہوتا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے: جو مہمات اس عبدِ صالحؑ کو حاصل تھیں وہ جنابِ موسیٰؑ کے مہمات سے مختلف تھیں۔

تفسیر قمی میں موجود ہے۔ انھوں نے جناب موسیٰؑ سے کہا تھا: جوامر مجھے سونپا گیا ہے اس کی آپؑ طاقت نہیں رکھتے اور جوامر آپؑ کو سونپا گیا ہے اس کی میں طاقت نہیں رکھتا۔ حضرت موسیٰؑ بصورتِ عامہ جناب خضرؑ سے اَعلم تھے لیکن جو علم انھیں ملا تھا وہ ان کی مہمات کی نسبت سے تھا۔ جناب موسیٰؑ کی معرفت ان سے ارفع و اعلیٰ تھی۔ آپ کو جناب خضرؑ کے پاس صرف اس لیے بھیجا گیا تھا کہ آپؑ ان علوم کے قوانین و اصول کی معرفت حاصل کریں جو جناب خضرؑ کے پاس تھے تاکہ آپؑ اپنی استعداد سے ان کی تفصیلات اور فروعات کے ابواب کو کھولیں۔

اسی امر پر یہ واقعہ دلالت کرتا ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام کے علم کے ہزار ابواب کی تعلیم دی تھی اور آپؑ نے ہر باب علم سے ہزار ہزار ابواب علم کھول لیے تھے۔

۵ خارق عادت امور

۶ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا انبیائے علیہم السلام کا کام صرف احکام کی تبلیغ نہ تھا۔ اس کے علاوہ بھی ان کی ذمہ داریاں تھیں۔ وہ صرف قیادت و امامت کے لیے نہیں آئے تھے بلکہ ہر نبیؑ مبلغ بھی تھا، ہادی بھی تھا، حاکم بھی تھا، اُمت کا محافظ بھی تھا، مدبر بھی تھا۔ ان کی سیرت کا پاسبان بھی تھا۔ نبی اپنے دور میں تمام موجودات کا مسئول ہوتا تھا۔ انسانوں کے علاوہ باقی موجودات جیسے شجر و حجر، حیوانات و پرندے، پانی و ہوا، ہر چیز پر وہ مسئول تھے۔ اس لیے انھیں ایسی استعداد بخشی گئی جو ان تمام امور زندگی پر محیط ہو اس لیے وہ عالم بھی تھے، عارف بھی تھے، مدبر بھی تھے اور حکیم بھی تھے۔ خداوند تعالیٰ نے انبیائے علیہم السلام کو تمام موجودات کی زبانوں کا علم دیا تھا۔ وہ پرندوں کی اور دوسرے حیوانات کی زبان کو سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہواؤں اور دوسری طاقتوں کو ان کے لیے مسخر کر دیا تھا۔ یہ تمام کرامات آپؑ

کو نبی کریمؐ کی حیات میں مل سکتے ہیں۔

۷ انبیائے علیہم السلام کو معجزات عطا ہوئے تھے۔ ہر نبیؑ کو اس کے دور کے مطابق معجزات عطا ہوئے۔ طی الارض، حجر و شجر سے گفتگو، لشکرِ کثیر کو ایک مٹھی بھر کھجور سے سیر کرنا یا نحیف و نزار بکری کے دودھ سے لشکر کو سیراب کرنا جیسے معجزات عطا ہوئے تھے۔

یہ تمام احوال ہماری نسبت سے معجزات ہیں اور ان کی نسبت سے یہ ان کی مسئولیت ہے۔ مقامِ ضرورت پر انھیں خداوند تعالیٰ کی طرف سے تصرف حاصل ہے کہ وہ ان امور کو عملاً حاضر کریں۔

۸ تمام انبیائے علیہم السلام علمِ شریعت اور علمِ دین و احکام کے لحاظ سے سب مشترک تھے۔ ان تمام کو اُن امور کی ضرورت تھی جو اُمت کی رہبری کے لیے اہم تھے۔ ان کے درمیان اگر کوئی تفاوت تھا تو اس علم کی بنیاد پر تھا جو ان کے علمی مدارج میں ارتقا کا سبب بنتا تھا اور وہ اس علم کو اللہ کے فضل و کرم سے حاصل کرتے تھے اور اپنی جدوجہد سے حاصل کرتے تھے۔ اس طرح انبیائے علیہم السلام عنداللہ بلند مقامات کے مالک بن جاتے تھے۔

جنابِ موسیٰؑ ایک عارف نبی تھے۔ انھوں نے جدوجہد کی کہ ان مقامات کو حاصل کرلیں جن سے معارف میں سیرِ تکامل حاصل ہوتا ہے۔ خداوند تعالیٰ نے انھیں یہ عرفان عطا کیا کہ ایک اس کا عبدِ صالح ہے جس کو اُس نے خاص علوم عطا کیے ہیں۔ ان پر واجب ہے کہ وہ ان کے پاس جائیں اور اُن سے یہ علوم حاصل کریں۔ اس امر سے جنابِ موسیٰؑ کی طرف کسی نقص و عیب کی نسبت نہیں دی جاسکتی کہ ان کی نبوت یا ان کے علم میں کمی تھی اور اس کمی کو پورا کیا جا رہا تھا۔ وہ نبیؑ تھے اور ان کا علم ہر نقص و عیب سے مبرا تھا۔ علمِ نبوت اور علمِ نبوت کی تمام ضرورتیں ان کے پاس بدرجۂ اتم

موجود تھیں۔

خداوند تعالیٰ کا ارادہ ہوا کہ اُس کے اس عظیم الشان نبی کو وہ علم بھی مل جائے جس کے ذریعے وہ ارفع واعلیٰ مقامات پر پہنچ جائیں۔ یہی انبیائے کرام سے توقع تھی کہ وہ ان مقامات کے حصول کے لیے بھرپور جدوجہد فرمائیں گے۔ اگر یہ جدوجہد اور کوشش وکاوش نہ ہوتو پھر وہ مقامِ نبوت کا استحقاق نہیں رکھتے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

کان موسیٰ اعلم من خضر

"جناب موسیٰؑ خضر سے اعلم تھے"۔

یا فرمایا:

کان موسیٰ أعلم من الذی اتبعه (البحار، ج ۱۳، ص ۳۰۳۔ ۳۰۹، عن تفسیر العیاشی)

"جناب موسیٰؑ اپنے پیروکاروں سے اعلم تھے"۔

۹ تمام انبیائے علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر بطور شاہد کے ہیں۔ ان کا مقام تقاضا کرتا ہے کہ انھیں خلائق کے تمام اعمال پر اطلاع ہونا چاہیے، حتیٰ کہ ان کے مشاعر ہیں یا ان کی نیات۔ وہ لوگوں کے اعمال کو ہر صورت دیکھتے ہیں۔ اگر وہ حالتِ خواب میں ہوں تو پھر بھی وہ لوگوں کے اعمال کو دیکھ رہے ہیں۔

ایک دفعہ جناب ابوذر غفاریؓ جناب رسولؐ اللہ کو تلاش کر رہے تھے کہ انھوں نے آپؐ کو ایک باغ میں حالتِ خواب میں پایا۔ انھوں نے ارادہ کیا کہ پیغمبرؐ کو جگائیں۔ آپ نے کھجور کی خشک ٹہنی لی اور اُس کو توڑا تا کہ اس کے ٹوٹنے کی آواز سے آپؐ نیند سے بیدار ہو جائیں گے۔ جب آپؐ نے یہ آواز سنی تو اپنا مبارک سر اُٹھایا اور فرمایا:

يَا اَبَاذَر ، تَخدَعني؟ اَمَا عَلِمتَ اَنّي اَرَىٰ اَعمَالَكُم فِي مَنامِي ، كَمَا اَرَاكُم فِي يَقظَتِي. اِنَّ عَينِي تَنَامَانِ وَلَا يَنَامُ قَلبِي (البحار، ج ۲۲، ص ۳۱۱۔ رجال الکشی، ص ۲۹)

"اے ابوذر! تو مجھے نہیں سمجھتا، میں تمہارے تمام اعمال کو نیند میں اس طرح دیکھتا ہوں جس طرح عالمِ بیداری میں دیکھتا ہوں۔ میری آنکھیں سوتی ہیں میرا دل نہیں سوتا"۔

یہ سیاستِ الٰہیہ ہے کہ اس کے نمائندگان بشر کی تمام حرکات وسکنات پر شاہد ہوں۔ اس طریقے سے بشر کا ایمان محفوظ رہے گا اور خداوند کے رسولوں اور اُس کے اولیاؤں سے رابطہ مضبوط ہوگا۔

۱۰ کچھ علوم ایسے ہیں جو معصوم علیہ السلام کو غیر عادی طریقے سے حاصل ہوتے ہیں۔ وہ علوم الہام ربانی سے حاصل ہوتے ہیں یا وحی کے ذریعے یا لوح محو و اثبات کے مطالعے سے یا اُم الکتاب کے ذریعے یا فرشتے کے ذریعے یا ایک گواہ کے طور پر وہ بشر کے احوال سوتے جاگتے برابر دیکھتے رہتے ہیں۔ یہ وہ علم ہے جس کے تقاضا جات لوگوں پر معصوم نافذ نہیں کرسکتا۔ ہم اپنے اس دعویٰ کی دلیل پیش کرتے ہیں (جب نبی اکرمؐ نے فرمایا: میں سوتے جاگتے تمہارے اعمال کو دیکھتا ہوں تو آپؐ نے کتنے لوگوں کو مختلف جرائم میں دیکھا ہوگا لیکن آپؐ نے کسی زانی پر حد جاری نہیں کی۔ کسی چور کے ہاتھ قطع نہیں کیے اور شراب پینے والے کو کوڑے نہیں مارے اور کسی قاتل کو قتل نہیں کیا۔ حالانکہ آپؐ اپنی اُمت پر شاہد تھے۔ علمِ غیب کے ذریعے آپؐ کو بتایا گیا تھا۔ جناب جبرئیلؑ نے بہت سے مقامات پر آپؐ کو آگاہی دی تھی وغیرہ وغیرہ۔

حضور سرورِ کائنات منافقین کو خوب جانتے تھے اور لیلۃ العقبہ کے مفروروں کو آپؐ جانتے تھے۔ آپ نے ان کے نام جناب حذیفہ یمان کو بتا دیئے تھے لیکن آپ

نے ان کو سزا نہیں دی حالانکہ آپ کا علم تقاضا کرتا تھا کہ وہ مجرم ہیں اور انھیں اس جرم کی سزا ملنی چاہیے۔ معصوم نے ان وسائل پر عمل کیا جو عادی تھے اور عام لوگوں کے اختیار میں تھے۔ وسائل عادی وہ ہیں جو آنکھوں سے دیکھے جاسکیں، کانوں سے سنے جاسکیں یا گواہ قائم ہو جائیں وغیرہ وغیرہ۔

یہی وہ اسباب تھے جن کی بنا پر حضرت امام علی علیہ السلام نے ابن ملجم سے مواخذہ نہیں کیا تھا کیونکہ یہ موقف سلبی تھا حالانکہ آپؑ نے لوگوں کو بتایا تھا کہ وہ میرا قاتل ہے۔ اس طرح امام علی رضا علیہ السلام نے انار کا رس پی لیا تھا یا انگور کھا لیے تھے حالانکہ آپؑ نے بتا دیا تھا کہ یہ زہر آلود ہیں (کیونکہ مامون نے جب آپؑ کے قتل کا ارادہ کیا ایک دفعہ انگوروں میں زہر ملائی اور دوسری دفعہ انار کے رس میں زہر شامل کی)۔

اس طرح حضرت امام حسین علیہ السلام جب سفرِ عراق کے لیے چلے تھے آپ کو تمام حالات سے مکمل آگاہی تھی کہ ان کے ساتھ کیا کچھ ہونے والا ہے اور ان کے بعد ان کے اہلِ بیتؑ کے ساتھ کیا ہوگا؟ آپؑ کو سب کچھ معلوم تھا اور یہ علم غیر عادی وسائل سے مربوط تھا۔ آپؑ اسی علم کی بنیاد پر لوگوں سے وہی تعامل نہیں کر سکتے تھے جس کے وہ مستحق تھے کیونکہ غیر عادی امور ان کے دائرۂ اختیار سے باہر تھے۔ اگر ایسا کرتے تو یہ عدلِ الٰہی کے خلاف ہوتا۔ اس سے ان کی حریت ختم ہوتی کیونکہ یہ ایک طبعی طریقہ نہیں ہے۔ قہری و جبری طریقہ ہے جس سے اُنھیں مجبور کر دیا جاتا اور ان کا اختیار ختم ہو جاتا۔

انبیائے علیہم السلام اور آئمہ طاہرین لوگوں کو ان امور کی خبر کیوں دیتے تھے؟ مثلاً مسموم انگوروں کی خبر دینا یا ابن ملجم کے بارے بتانا کہ وہ امامؑ کا قاتل ہے، یہ اس کے علاوہ اور بہت سی مثالیں ہیں۔ یہ ان لوگوں پر حجت قائم کرنا تھا کہ لوگ یقین کی

منزل پر پہنچ جائیں کہ وہ امامؑ ہیں۔ اس بات کا بھی اعلان تھا کہ وہ علمِ امامت کے مالک ہیں۔ یہ بھی بتانا مقصود تھا کہ مامون اور مامون صفت لوگ جس مقام پر بیٹھے ہیں اس کے اہل نہیں ہیں۔ وہ ظالم و غاصب ہیں۔ اور وہ اللہ اور اس کی حاکمیت اور اس کے بندوں کے حقوق پر جسارت کیے ہوئے ہیں۔ ہاں اگر کوئی آدمی امامؑ کے پاس آتا اور امامؑ کو خبر دیتا کہ یہ انگور مسموم ہیں یا امامؑ خود اپنے سامنے مامون کو انگوروں میں زہر ملاتے ہوئے دیکھتے یا انار کے رس میں زہر شامل کرتے ہوئے دیکھتے یا مامون خود آپؑ کے سامنے اعتراف کرتا کہ اُس نے ایسا کیا ہے تو ان تمام احوال میں معصوم کے لیے جائز نہیں ہے کہ رس کو پئیں یا ان انگوروں کو تناول فرمائیں۔ ان احوال میں امامؑ پر واجب ہے کہ شرعی اوامر کو نافذ کریں۔

اسی مقصد کی مزید وضاحت کے لیے رسولؐ اللہ کی حدیث ہے۔ آپ نے لوگوں کو فرمایا:

إِنَّمَا أَقْضِي بَيْنَكُم بِالْبَيِّنَاتِ وَالْإِيمَانِ ، وَبَعْضُكُم الْحَسَنُ بِحُجَّتِهِ مِنْ بَعْضٍ ، فَأَيُّمَا رَجُلٌ قَطَعْتُ لَهُ مِن مَالِ أَخِيهِ شَيْئًا ، فَإِنَّمَا قَطَعْتُ قِطْعَةً مِنَ النَّارِ

"تمہارے درمیان قضاوت کی بنیاد گواہ اور بینات میں اگر کوئی تم میں سے اپنی ذہانت کو حجت بناتے ہوئے اپنے بھائی کے مال کا کچھ حصہ لے گا تو اُس نے آگ کا حصہ لیا"۔ (وسائل الشیعہ، ج ۲۷، ص ۲۳۲، کافی، ج ۷، ص ۴۱۴۔ تہذیب الاحکام، ص ۲۲۹ و ۲۵۲، معانی الاخبار، ص ۲۷۹، تفسیر امام حسن عسکری، ص ۲۸۵، السنن الکبریٰ، بیہقی، ج ۱۰، ص ۱۴۳ و صحیح مسلم صحیح بخاری وغیرہ)

مزید بات کو آگے لے جاتے ہوئے ہم یہ کہیں گے: یہاں دو نقطے ہیں جو

طلب بحث ہیں:

① حضرت موسیٰؑ کے لیے کہا گیا کہ جو معاہدہ انھوں نے حضرت خضرؑ کے ساتھ کیا تھا اُسے توڑ ڈالا جو کام انھوں نے کیا تھا اس پر جناب موسیٰؑ کو خاموش رہنا چاہیے تھے۔ انھیں اعتراض کا حق نہ تھا۔

② جناب موسیٰؑ نے جناب خضرؑ سے فرمایا: لَا تُؤَاخِذْنِیْ بِمَا نَسِیْتُ تو اس کلام سے شیعوں کے عقیدہ پر نقص وارد ہوتا ہے کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ انبیائے علیہم السلام کو نسیان نہیں ہوتا۔ اس طرح حضرت موسیٰؑ کے نوجوان ساتھی کا کہنا: اَرَءَیْتَ اِذْ اَوَیْنَآ اِلَی الصَّخْرَۃِ فَاِنِّیْ نَسِیْتُ الْحُوْتَ وَ مَآ اَنْسٰنِیْہُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ اَنْ اَذْکُرَہٗ (الکھف:۶۳) ”جوان نے کہا: بھلا آپ نے دیکھا جب ہم چٹان کے پاس ٹھہرے تھے تو میں مچھلی وہیں بھول گیا؟ اور مجھے شیطان کے سوا کوئی نہیں بھلا سکتا کہ میں اُسے یاد کروں“۔

روایات میں ہے: وہ نوجوان یوشعؑ بن نون تھے جو جناب موسیٰؑ کے وصی تھے، نبیؑ تھے اور معصومؑ تھے۔

اب ایک اور ضروری سوال کا جواب دے رہے ہیں۔ حضرت خضرؑ نے ایک معصوم بچے کو جس نے ابھی جرم کا ارتکاب نہیں کیا تھا، قتل کر دیا اور اِدھر ابن ملجم کا قضیہ امام اپنے قاتل کی خبر دیتے ہیں لیکن اُسے قتل نہیں کرتے۔ ان دونوں قضیوں میں کیا فرق ہے؟

① اِنَّکَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا (الکھف:۶۷) ”آپؑ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے“۔

جب جناب موسیٰؑ نے جناب خضرؑ سے درخواست کی تھی ”کیا میں آپؑ کے پیچھے چل سکتا ہوں؟“ تو جناب خضرؑ نے فرمایا تھا: اِنَّکَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا

حضرت خضرؑ نے جناب موسیٰؑ کے صبر کے تمام جزئیات اور تمام پہلوؤں کی نفی کردی کہ آپؑ کسی صورت میں صبر نہیں کرسکیں گے۔ آیت کریمہ کے اندر "کلمہ صبر" نکرہ آیا ہے اور جب نکرہ نفی کے بعد آئے تو عموم کا فائدہ دیتا ہے۔ پھر وجہ بھی بتادی کہ آپؑ صبر نہیں کرپائیں گے۔

فرمایا: وَ كَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا (الكهف:٦٨) "اور اس بات پر آپؑ کیسے صبر کرسکتے ہیں جو آپؑ کے احاطۂ علم میں نہیں ہے"۔

اس واقعہ کو دیکھ کر بعض لوگوں کا خیال ہے۔ چونکہ حضرت موسیٰؑ ان امور پر قدرت نہیں رکھتے تھے اس لیے انھوں نے ان کے استحقاقِ نبوت میں شک کیا۔ کیونکہ انبیاء پر تو واجب ہے کہ وہ صبر کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہوں۔ ان کا یہ خیال غلط ہے۔ آیت ہے: وَ كَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا "اس بات پر بھلا آپؑ کیسے صبر کرسکتے ہیں جو آپؑ کے احاطۂ علم میں نہیں ہے"۔

یہ آیت ان کے عدمِ صبر کے سبب کو بیان کر رہی ہے۔ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے صبر کی نفی ہو رہی ہے کہ وہ صبر وتحمل کی قدرت وصفت سے بالکل خالی ہیں۔ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے۔ اسمِ نکرہ کا نفی کے بعد آنا عموم کا فائدہ دیتا ہے، بلکہ مقصد یہ ہے: حضرت موسیٰ علیہ السلام صبر کے تمام مراتب کے مالک ہیں۔ آپؑ کے اندر صبر کی قدرت اور استعداد مکمل طور پر ہے۔ حضرت خضرؑ ان سے یہی کچھ کہتے ہیں۔ اے موسیٰؑ! آپؑ ہر اعتبار سے صابر ہیں لیکن یہاں ایک مانع ہے جو آپؑ کو صبر کی طاقت جو آپؑ کے پاس ہے، استعمال نہیں کرنے دے گا۔ اگر آپؑ اس مقام پر صبر کریں گے وہ صبر تجھ جیسے اُولی العزم پیغمبرؑ کی حیثیت سے معقول ہوگا اور نہ مقبول ہوگا کیونکہ آپؑ کا صبر کرنا اس مقام پر آپؑ کی عصمت وعدالت کے منافی ہوگا۔ مقامِ نبوت کی صلاحیت کے فقدان کی علامت ہوگا۔ اگر آپؑ صبر کریں گے تو یہ

صبر دینِ الٰہی میں سُستی کا مظہر ہوگا۔ کیونکہ آپؑ کی مسئولیت تشریعی اُمور پر تھی۔
جنابِ خضرؑ کے تمام کام جو آپؑ کے سامنے ہوئے وہ ظاہراً شریعت کی مخالفت تھی۔ ان
امور پر آپ کا صبر آپؑ کی شرعی تکلیف اور آپ کے دین و شریعت کے منافی تھا کیونکہ
ان امور کے باطن پر آپؑ مطلع نہیں تھے۔ بادشاہ تمام سفینوں کو غصب کر رہا تھا اور
جنابِ خضرؑ کا اس سفینہ میں سوراخ کرنا ظاہراً شریعت کی مخالفت تھی کیونکہ شریعت
اجازت نہیں دیتی کہ کسی دوسرے کی ملکیت کو نقصان پہنچایا جائے۔ جب جنابِ خضرؑ
نے ایسا کیا تو آپؑ نے اس معاہدہ کی پرواہ نہ کی۔ جو معاہدہ عبدِ صالحؑ سے ہوا تھا۔
آپؑ نے اپنے وظیفۂ شرعی کو سامنے رکھتے ہوئے جنابِ خضرؑ پر اعتراض کر دیا کیونکہ
آپؑ کی مسئولیت و ماموریت ظواہر پر تھی۔ ان امور کے باطن سے آپؑ واقف نہ
تھے۔ اسی بات کی تفسیر آیت کے اندر موجود ہے۔

وَ كَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ایک ایسے امر سے استدلال
پیش کیا جا رہا ہے جو بدیہی اور فطری ہے۔ کیونکہ آپؑ اس امر کے باطن کو نہیں جانتے
کیونکہ یہ امر اپنے اندر اسرار رکھتا ہے۔ اسی لیے جنابِ موسیٰؑ کی طرف سے اعتراض
ضروری ہے اور یہ اعتراض اس وقت تک رہے گا جب تک امر کی وضاحت نہیں
ہو جاتی۔ کیونکہ فطرت و عقل و شرع کا تقاضا یہی ہے کہ آپؑ اعتراض کریں اور خاموش
نہ رہیں۔

اب سببِ اعتراض کی وضاحت تو ہوگئی ہے۔ اب اس سبب کی وضاحت
ضروری ہے کیا یہ سبب مشروع ہوگا؟ مالِ غیر میں تصرف ہوا ہے، نفسِ محترمہ کا قتل ہوا
ہے، دیوار کے بنانے میں کوئی اُجرت نہیں لی گئی۔ کیا یہ تمام امور شرعی ہو جائیں گے؟
جنابِ موسیٰؑ کو باطنی امور کا علم نہیں ہے۔ اس لیے ان کے نزدیک تو غیر مشروع ہیں۔
ان تین امور میں سے اقامت دیوار والے مسئلہ کا عذر ظاہری موجود تھا۔ وہاں کے

لوگ ظالم تھے۔ اس طرح جناب موسٰیؑ کا فعل عبدِ صالحؑ کے نزدیک وجہِ سوال ہے حالانکہ وہ ان کے ان اعتراضات سے قبل اشارہ کر چکے تھے کہ عنقریب مناسب موقع پر انھیں مطلع کر دیا جائے گا۔ کیونکہ یہ امور اپنے باطن سے مربوط ہیں۔ اب ان امور پر جناب موسٰیؑ حق نہیں رکھتے تھے کہ صبر کریں اور خاموش رہیں کیونکہ ان کے سر سے متعارف نہیں تھے اس لیے جناب خضرؑ نے فرمایا تھا:

اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا (الکہف:۷۲)

"میں نے نہ کہا تھا کہ تم میرے ساتھ ہرگز صبر نہیں کر سکتے"۔

اس مقام پر ہم کہیں گے: جناب موسٰیؑ کا کوئی وظیفہ نہیں تھا کہ ان غیر مادی امور میں غور و فکر کریں کیونکہ خداوند تعالیٰ نے انھیں حکم دیا تھا کہ وہ جائیں اور عبدِ صالحؑ سے علم حاصل کریں۔

اگر ہم فرض کریں کہ جناب موسٰیؑ کو صبر کرنا چاہیے تھا اور خاموش رہنا چاہیے تھا تو اس کا جواب یہ ہے: حضرت موسٰیؑ پر لازم تھا کہ وہ عبدِ صالحؑ سے علم سیکھیں۔ اور جناب موسٰیؑ کی ماموریت تشریعی امور پر تھی جن کا منبع علمِ شاہدیت تھا یا علمِ نبوت تھا۔ اِدھر جناب خضرؑ کا علم وہ بھی علمِ نبوت تھا، علمِ شاہدیت تھا۔ آپؑ کو وحی کے ذریعے ملا یا لوحِ محو و اثبات سے ملا لیکن وہ جناب موسٰیؑ کے لیے ایک "سِر" تھا جو ان سے صادر ہوا۔ اب اس مقام پر جناب موسٰیؑ کی شرعی تکلیف "سوال" ہے نہ کہ صبر و خاموشی۔ آپؑ پر لازم ہے کہ آپؑ ان امور کے فاعل عبدِ صالحؑ کی زبانی سنیں کہ آپؑ نے ایسا کیوں کیا؟ کیونکہ سوال کے تکلیف کا منشا مخالفت بانعین کی رُوئیت ہے کہ فاعل سے وجوہات کو سنیں۔ آثار کی ترتیب بھی اسی پر ہے اور شریعت نے تمام لوگوں کے لیے مقامِ اشتباہ میں یہی اصول مقرر فرمائے ہیں۔

اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت موسٰیؑ نے ہمیشہ اس خط کو اپنایا جو الٰہی خط

تھا۔ اب اگر جناب خضرؑ کے حضور میں ہیں تو پھر بھی آپؑ اسی خط پر ہیں۔ جو خط اللہ نے ان کے لیے مقرر فرمایا تھا۔ جو کچھ ان سے صادر ہوا ہے اس کے سبب کا سوال کریں۔ اس قصہ میں نہ تو جناب موسیٰؑ سے اپنی تکلیف مشخص کرنے میں خطا ہوئی۔ جو کچھ آپؑ پر واجب تھا۔ نہ اُس سے ذرا بھر اِدھر ہوئے اور نہ اُدھر آپؑ کے سامنے صرف الٰہی حکم تھا کہ آپؑ نے ان سے علم حاصل کرنا ہے۔ آپؑ نے اپنے موقف کی حفاظت کی کیونکہ آپؑ نبی تھے، رسول تھے اور اولوالعزم تھے۔

جنابِ موسیٰ علیہ السلام کے صبر کی توضیح

ہم نے گذشتہ صفحات میں اشارہ کیا ہے کہ حضرت خضرؑ نے جنابِ موسیٰؑ کے صبر کے تمام مفردات کی نفی کر دی تھی کیونکہ اسم نکرہ بعد از نفی عموم کا فائدہ دیتا ہے۔ پھر اسی نفی کو "حرف لَن" کے ساتھ موکد کیا گیا ہے۔ کیونکہ زمخشری کہتا ہے کہ "لَن" تاکید نفی کا فائدہ دیتا ہے اور تابید نفی کا فائدہ دیتا ہے۔

ہم زمخشری کے اس قول کی تائید کرتے ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں مطلق نفی بھی مستقبل میں آنے والے امور کے عدم حصول کا فائدہ دیتی ہے۔ تابید کا معنی بھی یہی ہے۔ اگر آپ قرآن مجید کی اس آیت میں غور کریں تو آپ پر واضح ہو جائے گا کہ "لَن" تابید نفی کے لیے نہیں آیا جیسے فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا (مریم:۲۶) "اور میں آج کسی سے بات نہیں کروں گی"۔ یہاں نفی کے لیے لَن آیا ہے لیکن اس کی نفی کو اَلْيَوْمَ کے ساتھ مقید کر دیا گیا ہے۔ یہاں اُس نے تابید کا فائدہ نہ دیا۔ اس طرح سورۂ بقرہ (آیہ ۹۵) میں ہے: وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا تو یہاں اس کی نفی کو ابداً کے ساتھ مقید کیا گیا ہے۔ زمخشری کے دونوں دعوے بلا دلیل ہیں۔ الیوم کے ساتھ جو مقید کیا گیا ہے تو ہم اس بارے میں کہیں گے: لفظ الیوم قرینہ ہے جو تابید کا فائدہ دے رہا ہے اور یہ اطلاق سے ہے اور اطلاق وہاں ہوتا ہے جہاں قرینہ ہو۔

قرآن کریم کی اس آیت میں تکرار ہے: وَلَا يَتَمَنَّوْهُ اَبَدًا۔ یہ تکرار تاکید کی وجہ سے ہے۔ اس میں کوئی اشکال نہیں بلکہ یہ بلاغت کا حصّہ ہے یا ہم یہ کہیں کہ اس نفی کا مدخول وہ مستقبل ہے جس کا قصد کیا گیا ہے اور اس آیت کریمہ میں نہی معلل ہے اور اس کی تعلیل تعجب کے سبیل پر آئی ہے۔ اس آیت میں جو نفی کی گئی ہے وہ صرف اور صرف قدرت واستطاعت کی نفی کی گئی ہے، صبر کی نفی نہیں کی گئی۔

جناب موسیٰؑ سے یہ نہیں کہا گیا تھا: انك لا تصبر یا یہ نہیں کہا گیا تھا: لن تصبر بلکہ آپؑ کو کہا گیا تھا کہ آپؑ اب اور آنے والے زمانے میں جب تک ان امور باطنیہ کو دیکھتے رہیں گے آپ فاقد القدرت ہوں گے۔ وہ قدرت جو صبر سے مربوط ہے۔ آپؑ کے لیے لا تستطیع کے الفاظ بھی استعمال نہیں کیے گئے۔ کیونکہ ایسا کہا جاتا تو آپؑ کی قدرت کی فعلیت کی نفی ہوتی۔ یعنی آپؑ آنے والے زمانے میں بھی مستطیع نہیں ہوں گے لیکن ایسا نہیں ہے صرف محدود زمانے میں آپؑ ان امور باطنی پر صبر کی طاقت نہیں رکھ سکتے۔

جب ہم اس علت میں غور کریں گے تو ہمیں معلوم ہو جائے گا۔ یہ تعلیل امر حقیقی و واقعی کے ساتھ ہے جس کو جناب موسیٰؑ سمجھتے ہیں۔ اگر وہ صبر کرتے ہیں تو امر حقیقی جو اُن کا وظیفہ ہے وہ ادا نہیں ہوتا۔ اس کا مقصد یہ ہے گویا آپؑ سے کہا جا رہا ہے کہ اس مقام پر صبر کا صدور آپؑ سے ممکن ہی نہیں ہے حالانکہ آپؑ قدرت رکھتے ہیں کیونکہ یہاں جو قضیہ ہے وہ طاقت کے عدم و وجود کا نہیں ہے بلکہ قضیہ یہ ہے کہ اے موسیٰؑ! آپؑ سے ممکن ہی نہیں ہے کہ آپؑ صبر کو اختیار کریں کیونکہ آپؑ کے پاس ایک مانع موجود ہے۔ اس بحث سے یہ اشارہ ملتا ہے: جناب موسیٰؑ کے سامنے جو امر ہے وہ علمی ہے، ادراکی ہے اور باطن سے مربوط ہے جس کا صبر و تحمل سے تعلق نہیں کیونکہ جناب موسیٰؑ کو اس راز کی معرفت نہیں ہے۔ جس کی معرفت جناب خضرؑ کو

ہے۔ جنابِ خضرؑ کا یہ فعل ظاہراً معصیت اور تعدی ہے اور ظلم وتعدی سے شارع نے روک دیا ہے، یا کم از کم ناظر کے لیے اتنا تو لازم ہے کہ ان امور کی وضاحت طلب کرے۔

نتیجہ کلام یہی ہوا کہ یہ امور باطنی جنابِ موسیٰؑ کے اختیارات میں مداخلت تھی اسی لیے آپؑ نے معاہدہ کی پروانہ کی اور جنابِ خضرؑ پر اعتراض وارد کر دیا۔

جنابِ موسیٰؑ کا معاہدہ

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جنابِ موسیٰؑ نے جنابِ خضرؑ سے عہد کیا تھا اور اس عہد کو جنابِ موسیٰؑ نے توڑ ڈالا۔ اس کے بارے میں ہم یہ کہیں گے کہ ان کا اعتراض اپنے مقام پر صحیح نہیں ہے کیونکہ آیاتِ مقدسہ خود اس امر کی توضیح کرتی ہیں۔

حضرت خضرؑ نے جنابِ موسیٰؑ سے فرمایا: اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ○ وَ كَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا (الکہف:۶۷-۶۸) ”آپؑ میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے اور آپؑ بھلا کیسے صبر کر پائیں گے اس امر پر جو آپؑ کے احاطۂ علمی میں نہیں ہے“۔

اور جنابِ موسیٰؑ نے ان کے جواب میں کہا تھا: سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا (الکہف:۶۹) ”ان شاء اللہ مجھے صابر پاؤ گے“۔ آپؑ نے اپنی گفتگو سے بتا دیا کہ ان کے پاس کتنا صبر ہے اور وہ صبر مرہونِ مشیت خداوندی ہے اور یہی صبر ان سے طلب کیا جائے گا۔ ستجدنی کے قول میں غور فرمائیں۔ یہ قول دلیل ہے کہ ان کے پاس صبر ہے، ممکن ہے اسی صبر کے بارے میں جنابِ خضرؑ نے فرمایا تھا: آپ نے وعدہ کیا تھا: بان لا یعصی له امرًا کہ ان کے کسی امر کی مخالفت نہیں کروں گا۔ آپؑ نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا۔ کوئی اشارہ ایسا نہیں ملتا جہاں آپؑ نے جنابِ خضرؑ کے امر کی مخالفت کی ہو۔ حضرت خضرؑ نے جنابِ موسیٰؑ سے آخر میں کہا تھا:

فَاِنِ اتَّبَعْتَنِیْ فَلَا تَسْئَلْنِیْ عَنْ شَیْءٍ حَتّٰی اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ○ فَانْطَلَقَا حَتّٰی اِذَا رَكِبَا فِی السَّفِیْنَةِ خَرَقَهَا قَالَ اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا لَقَدْ جِئْتَ شَیْئًا اِمْرًا (الکہف: ۷۰-۷۱)

''اچھا اگر تم چاہتے ہو تو میرے پیچھے پیچھے آجاؤ اور دیکھو کسی مسئلے کے بارے میں سوال نہ کرنا یہاں تک کہ میں خود (موقع) پر تجھ سے بیان کروں گا۔ پس وہ دونوں چل پڑے''۔

اس آیت کے اوّل میں ''اِن'' شرطیہ ہے جو شک کا فائدہ دیتا ہے نہ وہ کلمہ ہے جس سے یقین کا فائدہ حاصل ہو۔ بات ہے ان شرطیہ کی تو معلوم ہوا ان دونوں کے درمیان معاہدہ نہیں ہوا تھا۔ جناب موسیٰؑ کے لیے دو راستوں میں سے ایک راستہ تھا جب آپؑ کو ان امور پر اطلاع ہوگئی ہے جن پر آپؑ صبر نہ کرسکے تھے۔ لیکن جناب خضرؑ نے جناب موسیٰؑ سے مطالبہ کیا تھا۔ ان لا یسالہ عن شیءٍ حتّٰی حدث لہٗ ھو منہ ذِكْرًا '' کہ اُس وقت تک وہ سوال نہیں کریں گے جب تک وہ خود انھیں نہ بتائیں''۔

جب جناب موسیٰؑ نے سنا تو خاموش ہوگئے اور ساتھ چل پڑے۔ اس بات سے واضح ہے کہ جناب خضرؑ نے جناب موسیٰؑ سے یہ مطالبہ نہیں کیا تھا کہ آپ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی نہیں کرنا۔ اگر ایسا مطالبہ ہوتا تو یہ شریعت کے خلاف ہوتا۔ جناب خضرؑ اور جناب موسیٰؑ دونوں نبی جانتے تھے کہ یہ تمام اوامر اللہ کی طرف سے ہیں۔ اور کسی ایک کے لیے جائز نہیں ہے کہ ان اوامر کو ملغیٰ قرار دیں، یا ان کو معطل کردیں بلکہ معاملہ یہ ہے کہ یہ امور جناب خضرؑ سے صادر ہوں اور جناب موسیٰؑ اعتراض وسوال کریں اور جناب خضرؑ ان سوالات کا جواب دیں۔

حضرت خضرؑ کو کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ایسا امر کریں اور جناب موسیٰؑ کو بھی کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ ان کے حکم کا اسی صورت میں جواب دیں جس کا اظہار انھوں نے فرمایا۔

آپؑ نے فرمایا: فَلَا تَسْـَٔلْنِىْ عَنْ شَىْءٍ حَتّٰٓى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا (الکہف:۷۰)۔ یہ فرمان ان امور پر مشتمل ہے کہ ان امور کی مخالفت ظاہراً شریعت کی مخالفت نہیں ہے۔ اس میں جناب موسیٰؑ کو خیار حاصل ہے۔ خاموش رہیں یا خاموش نہ رہیں لیکن جناب موسیٰؑ اپنے اس خیار کو استعمال کرتے ہیں جو ان کے لیے لازم ہے اور یہاں جناب خضرؑ کے لیے یہ جائز نہیں تھا۔ وہ ان پر سکوت کو لازم کردیں اور موسیٰؑ نے ان سے اس بات پر تعہد نہیں کیا تھا۔

جس طرح کہ یہ معاملہ بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ جناب موسیٰؑ نے فرمایا تھا: بان لا یعصی له امرًا کہ وہ ان کے امر کی مخالفت نہیں کریں گے اور جناب موسیٰؑ پر لازم نہ تھا کہ وہ ان اوامر کی اطاعت کریں جو اللہ تعالیٰ کی معصیت کو متضمن ہوں کہ اپنے عہد کو نبھائیں اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کریں۔ یہ سب گفتگو اس امر پر دال ہے کہ انھوں نے جو وعدہ کیا تھا وہ یہ تھا کہ وہ ان کی اطاعت اتنی کرے گا جو اس کے لیے جائز ہوگی۔

لَا تُؤَاخِذْنِىْ بِمَا نَسِيْتُ

حضرت موسیٰؑ جناب خضرؑ سے فرماتے ہیں: لَا تُؤَاخِذْنِىْ بِمَا نَسِيْتُ وَلَا تُرْهِقْنِىْ مِنْ اَمْرِىْ عُسْرًا (الکہف:۷۳) ”اس بھول پر میرا مواخذہ نہ کریں اور اس امر پر مجھ پر سخت گیری نہ کریں“۔

ہم پر واجب ہے کہ ہم اس فرمان کی طرف توجہ دیں۔ آیت کے الفاظ یہ نہیں ہیں: لا تواخذنی لاننی نسیت ”میرا مواخذہ نہ کریں کیونکہ میں بھول گیا ہوں“ یا

یہ نہیں فرمایا: لا تواخذني نسياني...... "میرے نسیان کی بدولت میرا مواخذہ نہ کرو"۔

اس سے یہ سمجھا گیا ہے کہ جناب موسیٰؑ نسیان کی نسبت اپنی طرف دے رہے ہیں۔ وہ اُس نسیان کا سبب ان کا اعتراض ہے جو آپؑ سے صادر ہوا اور اُس کے لیے طلب عفو کر رہے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نسیان کا سبب امر الٰہی تھا اور تکلیف شرعی تھی۔ اس لیے جناب خضرؑ سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ ان کے اعتراض پر مؤاخذہ نہ کریں۔ سوال یہی ہے بما نسیت۔ اس چیز پر جو چیز جناب خضرؑ نے جناب موسیٰؑ سے طلب کی تھی اور وہ چیز تھی: ان لا يسأله عن شيء حتّٰى يحدث له منه ذكرًا۔ حضرت موسیٰؑ نے اس امر کو بصورتِ عمداً ترک کر دیا تھا کیونکہ ان پر اس امر سے اہم ترین امر نازل ہو چکا تھا جو تکلیف الٰہی پر مشتمل تھا۔ اب آپؑ کی توجہ کا مرکز صرف امر الٰہی تھا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کا قول ہے:

كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَ كَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى
(طٰہٰ: ۱۲۶)

"اس طرح ہماری آیات تیرے پاس آئی تھیں اور تو نے انھیں بھلا دیا تھا اور اس طرح آج کے دن تجھے بھلا دیا گیا ہے"۔

اب اس آیت مقدسہ سے کیا سمجھا جائے گا کیا خداوند تعالیٰ کو بھی نسیان ہوتا ہے؟ حالانکہ خداوند تعالیٰ کو نسیان نہیں ہوتا۔ تو اس آیت کا مفہوم یہ ہے: کافر کو مقامِ نسیان میں رکھ دیا جائے گا اور اُس کی طرف کوئی التفات نہیں ہوگی، اور نہ اُس کے بارے کوئی سوچ بچار ہوگی۔

جو کچھ ہم نے ابھی بیان کیا ہے اس میں غور فرمائیں۔ جب حضرت موسیٰؑ سے جناب خضرؑ پر اعتراض وارد ہوا تو انھوں نے جناب موسیٰؑ سے کوئی مواخذہ نہ کیا اور

پہلے اعتراض پر انھوں نے یہ نہیں فرمایا تھا: هذا فراق بيني وبينك۔ یہ مورد میرے اور آپؑ کے درمیان مقام جدائی ہے اور نہ دوسرے موقع پر ایسا فرمایا۔ جناب خضرؑ کے لیے ایسا کرنا جائز ہی نہ تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے وعدہ کرلیا تھا۔ اگر تیسری مرتبہ ان سے اعتراض ہوجائے تو پھر تمہاری اور میری یہ مصاحبت ختم ہوجائے گی۔ اگر آپؑ یہ وعدہ نہ کرتے تو ان کے سامنے ایسے دس مقامات آئے اور جہاں جہاں جناب موسیٰؑ نے اعتراض کیا۔ جناب خضرؑ نے کہیں بھی ان سے مواخذہ نہ کیا۔ آخرکار معاملہ مفارقت پر پہنچا۔

ہمارے اس موقف کی تائید اس کلام سے ہوتی ہے۔ جناب موسیٰؑ نے فرمایا: وَلَا تُرْهِقْنِیْ مِنْ اَمْرِیْ عُسْرًا (الکہف:۷۳) ''اس امر پر میری سخت گیری نہ کریں''۔

حضرت خضرؑ کا مواخذہ اس مقام پر سخت گیری کا سبب ہوتا جس کی طاقت جناب موسیٰؑ کے پاس نہ تھی۔ تو اس لحاظ سے یہ امر عقلاً وشرعاً مرفوض تھا۔ جناب خضرؑ نے امر کو سامنے رکھا تھا اور حضرت موسیٰؑ کے سامنے حرفِ خیار تسلیم رکھا تھا۔ اب جناب موسیٰؑ کے لیے لازم تھا کہ وہ ان کے امر کو تسلیم کریں۔ اگر ان کے سامنے اس سے بھاری امر نہ ہوگا۔ اگر عقل وشرع کا حکم آجائے تو پھر جناب موسیٰؑ کا وظیفہ بدل جائے گا۔

جناب خضرؑ نے پہلی اور دوسری مرتبہ جناب موسیٰؑ کو امر کی یاددہانی کرائی اور تیسری مرتبہ ان امور کے باطن پر آگاہی دی۔ اگر موسیٰؑ کو ان امور کے باطن کا علم ہوتا تو آپؑ ضرور صبر کرتے لیکن معاملہ وہی تھا کہ آپؑ کو علم نہ تھا اس لیے جناب خضرؑ نے فرمایا: اَلَمْ اَقُلْ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا

''ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے یہی کچھ ظاہر ہے۔ وہ نسیان جس کی

نسبت جناب موسیٰؑ نے اپنی طرف دی ہے: لَا تُؤَاخِذْنِیْ بِمَا نَسِیْتُ ۔ آپ پر لازم تھا اور وہ آپؑ کے کمالات کا مظہر تھا۔ اور آپ کی تعظیم وتکریم اور اجلال کے اسباب میں سے تھا نہ کہ وہ آپؑ کے نقص کا سبب تھا۔

وَمَآ اَنْسٰنِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ

وہ جوان جن کا اسمِ گرامی یوشعؑ بن نون تھا جو جناب موسیٰؑ کے وصی تھے۔ جب ان سے جناب موسیٰؑ نے مچھلی کے بارے پوچھا۔ وہ مچھلی آپؑ اور آپ کے ساتھی کے لیے بطور زادِراہ تھی تو انھوں نے فرمایا: وَمَآ اَنْسٰنِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ اَنْ اَذْکُرَهٗ (الکہف: ۶۳) ''میں مچھلی کے بارے میں بھول گیا تھا اور یہ بات شیطان نے میرے ذہن سے نکال دی تھی''۔

جناب یوشعؑ معصوم تھے وہ کیسے بھول گئے اور شیطان کیسے ان پر مسلط ہو گیا۔ کہ وہ اس بات کو بھول گئے تھے کہ جو کچھ انھوں نے اس مچھلی کے بارے دیکھا تھا کہ وہ زندہ ہوئی اور پانی میں چلی گئی اور اُس نے اس پانی میں راستہ بھی ایک عجیب طریقے سے چھوڑا۔ یہ سب کچھ جناب موسیٰؑ کو بتانا بھول گئے تھے۔ جناب موسیٰؑ ان کے قریب تھے کوئی دُور نہ تھے۔ اتنا عظیم واقعہ ہوا اور اتنا جلدی بھول گئے۔ اپنی جگہ ایک سوال ہے اور اس کے جواب میں ہم کہیں گے:

۱۔ جب جناب یوشعؑ بن نون کی عصمت دلائل و براہین سے ثابت ہو گئی ہے اب بھی اگر ہمیں بات سمجھ نہ آئے تو اپنے آپ کو متہم کریں گے کہ ہم نے آیت کو سمجھا ہی نہیں۔ اللہ سے دعا مانگیں تاکہ ہم پر اپنی آیات کے معانی کے دروازے کھولے۔

۲۔ ہمیشہ معصوم کی شان رہی ہے وہ انکساری و تواضع سے [illegible] اپنے کمال کا دعویٰ نہیں کرتا۔ وہ اپنے آپ کو اس بنیاد پر [illegible] ہے۔ یہاں اس مقام پر جناب یوشعؑ اپنے آپ کو قصور وار [illegible]

کو فعلِ شیطان سے تعبیر کر رہے ہیں۔ قرآن کا فیصلہ ہے: ان الشیطان لہ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۔ یقیناً حضرت یوشعؑ انہی لوگوں میں سے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو جناب خضرؑ کی ملاقات کے لیے بھیجا تھا اور اسی مچھلی کے واقعہ کو جو غیر عادی تھا۔ مقامِ خضرؑ کے تعارف کی علامت بنایا تھا۔ جناب یوشعؑ کا نسیان اس عظیم واقع کی جناب موسیٰؑ کے لیے ایک خبر تھی۔ علاوہ ازیں یہ واقعہ جناب موسیٰؑ کے حضور میں ہوا اور یہ نبیؑ کے لیے علامت تھی جس مقصد کے لیے آئے ہیں آپؑ کو اپنا مقصود مل گیا۔ یہ نسیان یا تو جناب یوشعؑ کی تازگی و جوانی کی وجہ سے تھا یا امرِ الٰہی تھا۔

دوسرا قول صحیح ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔ جناب یوشعؑ کا نسیان تصرفِ الٰہی کا حصہ تھا۔ ہم اس نسیان کو موت سے ثابت کرتے ہیں۔ موت خداوند تعالیٰ اپنے انبیاءؑ کو دیتا ہے حالانکہ ان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کیونکہ ان کے نفوس اللہ کی امانتیں ہیں یا اسی نسیان کو نیند سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ نیند بھی اللہ انہیں دیتا ہے۔ اس طرح بیماری ہے، ان کے لیے جائز نہیں ہے کہ اپنے آپ کو بیمار کریں۔ یہ بیماری بھی انہیں اللہ دیتا ہے۔

جناب یوشعؑ کا نسیان ارادۂ الٰہی کے تابع تھا تاکہ جناب موسیٰؑ کو علم ہو جائے کہ آپؑ نے اپنی منزلِ مقصود پالی ہے ورنہ انبیاءؑ اور معصومینؑ کو نسیان نہیں ہوتا۔

❋......❋......❋

چھٹا حصّہ

ہجرت

امام علی علیہ السلام

سوال کیا امام علی علیہ اسلام کا کارنامہ صرف شبِ ہجرت رسول اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پر سونا ہے یا اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے؟
شیعہ حضرات کی خدمت میں گزارش ہے کہ تم ہر وقت امام علیؑ کے جہاد کی بات کرتے رہتے ہو۔ اس کے علاوہ تمہیں کوئی اور نظر ہی نہیں آتا۔ آیئے دیکھتے ہیں رسولؐ اللہ کی مکی زندگی میں علیؑ تو نظر ہی نہیں آتے سوائے شبِ ہجرت کے کہ اس رات آپؑ رسولؐ اللہ کے بستر پر سوئے تھے اور اس مکی زندگی میں حضرت ابوبکر تو رسولؐ اللہ کے بمنزلہ وزیر و مشیر نظر آتے ہیں۔ آپ کی مکی زندگی تیرہ سال پر محیط ہے۔

جواب یہ گفتگو حق و حقیقت سے دُور ہے۔ امام علی علیہ السلام صرف شبِ ہجرت پیغمبرؐ کے بستر پر نہیں سوئے تھے۔ اس کے علاوہ ایک لمبا عرصہ ہے جس میں امام علی علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پر سوتے رہے۔ شعب ابی طالب کا مشہور ترین واقعہ آپ کے سامنے ہے۔ جب مشرکین نے رسولؐ اللہ اور بنوہاشم کو اس مقام پر محصور کر دیا تھا۔ مشرکین کا ہدف رسولؐ اللہ تھے۔ حضرت ابوطالبؑ رات

کو ایک خاص مقام پر رسولؐ اللہ کو سلاتے۔ جب سب لوگ سو جاتے تو آپ اُٹھتے اور رسولؐ اللہ کو حضرت علیؑ کی جگہ پر سلاتے اور حضرت علی کو رسولؐ اللہ کی جگہ پر سلاتے تھے۔ یہ سلسلہ ایک لمبے عرصہ تک جاری رہا۔ بستر تبدیل کرنے کا مقصد یہ تھا کہ رسولؐ اللہ کی زندگی محفوظ رہے اور امام علیؑ ان پر قربان ہو جائیں۔ حضرت علیؑ کو اپنے والد گرامی کی تمام تدابیر کا علم تھا اور آپؑ خوشی خوشی اپنے والد کی تجاویز کو اپنا رہے تھے۔

مزید اضافہ کرتے ہوئے کہوں گا جب رات ہوتی تو حضرت علی علیہ السلام مکہ تشریف لے جاتے اور بعض گھروں سے بنو ہاشم کے لیے کھانا لے آتے۔ یہ ایک ایسی تاریخی نص ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر آپؑ مشرکین کے ہاتھوں لگتے تو وہ آپؑ کو قتل کر دیتے۔

مزید برآں حضرت علیؑ نے اپنی مکی زندگی میں مشرکین کے خلاف خوب جہاد کیا تھا۔ جب مشرکین کے لڑکے رسولؐ اللہ کو اذیت دینے کے لیے اکٹھے ہوتے تو اس وقت امام علیؑ آپؐ کا دفاع کرتے، اس لیے آپؑ "قضیم" کے نام سے معروف ہوئے۔

جب حضرت ابوذرؓ کی رسولؐ اللہ سے ملاقات ہوئی اور آپ رسولؐ اللہ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے۔ یہ محنت اور کوشش حضرت علیؑ کی تھی کیونکہ حضرت ابوذرؓ حضرت علیؑ کے پاس تین دن مہمان رہے تھے اور ان دنوں رسولؐ اللہ دار ارقم میں تشریف فرما تھے۔

اور "جس" کو حضرت علیؑ کے مقابلے میں پیش کیا جا رہا ہے وہ رسولؐ اللہ کی مکی زندگی میں نظر ہی نہیں آتے سوائے اس کے کہ وہ رسولؐ اللہ کے ہاتھ پر اسلام لائے تھے یا سفرِ ہجرت کے واقعہ میں ہم سفر ہونا وغیرہ ان تمام واقعات کو ہم نے ادلہ قاطعہ سے ثابت کیا ہے اور جو کارنامے ان کے مداحوں نے بیان کیے ہیں وہ بھی ہم نے بیان کر دیے ہیں۔ میری کتاب "الصحیح من سیرت النبی الاعظمؐ، ج ۲ کی طرف رجوع کریں۔

یہ باتیں جو حضرت علیؑ کی تنقیص پر مشتمل ہیں وہ ان لوگوں نے بیان کی ہیں جن کا اپنے رہبروں کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ رسولؐ اللہ کو کسی سے مشورہ کی ضرورت نہ تھی کیونکہ وہ وحی سے مربوط تھے۔ ہاں چند ایک موارد میں اہلِ اسلام سے مشورہ کا حکم ہے۔ اور یہ بھی ان کے قلوب کے تالیف کے لیے تھا یا کچھ دوسرے مصالح تھے۔ آپؐ کو کسی کی رائے کی ضرورت نہ تھی۔

اَلوِلَایَۃُ وَالوَلَایَۃُ

سوال بعض لوگ کہتے ہیں کہ الولایۃ والولایۃ کا معنی محبت، نصرت اور صداقت ہے۔ حدیث غدیر کی روشنی میں تشریح فرمائیں۔

جواب راغب اصفہانی نے ولایت بالکسر کا معنٰی نصرت لکھا ہے اور ولایت بالفتح کا معنٰی امارت لکھا ہے لیکن لغت کی دوسری کتب راغب کے اس معنٰی سے اتفاق نہیں کرتیں (اقرب الموارد، مادہ ولی)۔ حدیثِ غدیر کی روشنی میں ولایت کا معنی ہے: "تولیت امر" یعنی "امارت"۔ علامہ امینیؒ نے بھی اپنی کتاب الغدیر میں یہی معنٰی لکھا ہے۔ قرائن کثیرہ بھی اسی معنی پر دال ہیں۔

جنابِ زہراءؑ کی زندگی میں حضرت علیؑ کا شادی نہ کرنا

سوال وہ کون سے اسباب تھے جن کی بنا پر حضرت علیؑ نے حضرت سیدہ زہراء سلام اللہ علیہا کی زندگی میں دوسری شادی نہیں کی۔ حالانکہ شریعت میں چار شادیاں مستحب عمل ہے۔ آپؑ نے یہ استحباب کیوں ترک فرمایا؟ کیا دوسری شادی حضرت زہراءؑ حضرت علیؑ کے لیے ناپسند کرتی تھیں؟ جب قرآن کا فیصلہ ہے تو

حضرت زہراؑ کیوں راضی نہ ہوئیں؟

جواب پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن مجید میں ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کا استحباب ہے ہی نہیں۔ اگر اباحت وارد ہے تو وہاں نصیحت بھی ہے کہ متعدد ازواج کی صورت میں جو ایک سے زائد ہیں، خوف ہے کہیں ان بیویوں کے درمیان عدالت قائم نہ ہو سکے۔

ہاں اگر تعدد ازدواج کی بات ہے تو وہ اس صورت میں ہے کہ جب انسان فقیر ہو اور اس تعدد سے اس کے فقر کا علاج ہو جائے یا کوئی اور مسئلہ جو اس کی مثل ہو۔ اس طرح استحباب موضع شک میں آجاتا ہے اس لیے سوال مذکور کا موضوع ختم ہو جاتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جناب شیخ صدوقؒ نے ایک روایت کی ہے: حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: جب تک حضرت سیدہ زہراؑ زندہ رہیں اللہ تعالیٰ نے حضرت علیؑ پر دوسری عورتیں حرام کر دی تھیں۔ راوی کہتا ہے: وہ کیوں؟ تو آپؑ نے فرمایا: وہ طاہرہ تھیں وہ خونِ حیض سے پاک تھیں۔

شیخ کے علاوہ عامہ اور خاصہ دونوں نے اس فرمان کو روایت کیا ہے۔ (تہذیب الاحکام، ج ۷، ص ۴۷۵ و مقتل الحسین خوارزمی، ج ۱، ص ۶۴، مناقب آل ابی طالب، ج ۳، ص ۳۳۰ و ابحار، ج ۴۳، ص ۱۶-۵۳۔ امالی شیخ طوسی، ج ۱، ص ۴۲۔ مستدرک الوسائل، ج ۳، ص ۴۲، وبشارۃ المصطفیٰ، ص ۳۰۶۔ عوالم العلوم، ج ۱۱، ص ۳۸۷، وضیا العالمین، ج ۲، ص ۲، قسم ۲، ص ۷۔ مجمع النورین، ص ۲۳، لمعہ البیضاء)

تیسری بات یہ ہے قرآن مجید کی آیت ہے:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (الروم: ۲۱)

''اور یہ اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اُس نے تمہارے لیے
تمہاری ہی جنس سے ازواج پیدا کیے تا کہ تم ان سے سکون
حاصل کرو اور اُس نے تمہارے بین محبت اور مہربانی پیدا کی۔
غور وفکر کرنے والوں کے لیے یقیناً ان میں نشانیاں ہیں''۔

آیت مبارکہ اس بات پر دلالت فرما رہی ہے کہ ازواج کا مقصد سکون ہے اور یہ سکون اُس وقت ہوتا ہے جب توحد ہو (تعدد نہ ہو) تو اُس وقت شوہر اور بیوی نفسِ واحدہ کی طرح ہوتے ہیں۔ یہ امر واضح ہے جناب سیدہ جناب علیؑ کے ساتھ اس طرح نہیں جس طرح نفسِ واحدہ ہو اور حضرت علیؑ نے جناب سیدہؑ کی زندگی میں کسی اور زوجہ کی ضرورت محسوس ہی نہ کی اور جناب سیدہؑ کمال کُل تھیں۔ ان کی موجودگی میں کسی شے کی کمی نہ تھی۔ اب معترض کہاں ہے جو امام علی علیہ السلام پر اعتراض کر رہا تھا اور یہی حال رسولؐ اللہ کا رہا تھا۔ آپؐ نے حضرت خدیجہؑ کی زندگی میں کوئی دوسری شادی نہ فرمائی۔ ان کے بعد آپؐ نے متعدد ازواج فرمائیں۔

رسولؐ اللہ، حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہ زہراؑ

سوال بارگاہِ رسالت میں ان دونوں (حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہ زہراؑ) میں سے کس کا مرتبہ زیادہ تھا؟

جواب طریق اہلِ سنت سے حدیث میں وارد ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت امام علی علیہ السلام کو فرمایا:

فَاطِمَةُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْكَ وَاَنْتَ اَعَزُّ عَلَیَّ مِنْھا

''اے علیؑ! فاطمہؑ مجھے تم سے بہت زیادہ محبوب ہے اور تم میرے نزدیک ان سے زیادہ معزز ہو''۔ (مجمع الزوائد، ج ۹، ص ۲۰۲، طبرانی، نزہۃ المجالس، ج ۲، ص ۲۲۲، صواعق محرقہ، ص ۱۸۹، طبع

عبدالمطلب، مصر، منتخب کنز العمال حاشی مسند احمد، ج ۵،ص ۹۷ و کنوز الحقائق،ص ۱۰۳ و ینابیع المودۃ،ص ۱۸۳، ۱۸۶۔ اسعاف الراغبین حاشی نورالابصار،ص ۱۸۹، خصائص نسائی،ص ۳۷، طبع مصر۔ اسد الغابہ، ج ۵،ص ۵۲۲، تذکرۃ الخواص،ص ۳۱۶، کفایۃ الطالب،ص ۱۷۳، ذخائر العرفی، ص ۲۷، البدایۃ والنہایۃ، ج ۷، ص ۳۴۱، مقتل خوارزمی، ص ۶۸، بحار، ج ۳۷، ص ۸۵، وج ۴۳،ص ۳۸ عن ابی نعیم وغیرہ)

اس طرح یہ حدیث بھی ہے: ''تمام مردوں میں سے علیؑ اور تمام عورتوں میں سے جناب سیدہ زہراؑ مجھے محبوب ہیں''۔ (بحار، ج ۴۳،ص ۳۸، ملحقات احقاق الحق، ج ۸،ص ۲۶۸ وغیرہ، ج ۱۵،ص ۵۳۸-۵۴۳)

ایک حدیث یہ بھی ہے، آپؐ نے فرمایا:

عَلِیٌّ اَحَبُّ اَھْلِیْ اِلَیَّ

''میرے اہل بیتؑ میں میرے سب سے زیادہ مرکز محبت علیؑ ہیں''۔ (ملحقات احقاق الحق، ج ۱۵،ص ۵۴۳-۵۳۸)

حضرت ابوذر غفاریؓ کا بیان ہے جو اسی بات کی دلالت کرتا ہے: ''امام علیؑ رسولؐ اللہ کو تمام لوگوں سے زیادہ محبوب تھے''۔ (المصدر السابق، ج ۱۵،ص ۵۴۴)

رسولؐ اللہ کی یہ حدیث بھی ہے کہ ''تمام مخلوق میں مجھے سب سے زیادہ محبت حضرت سیدہ زہراؑ سے ہے۔'' (مصدر سابق،ص ۱۵۸، ۱۵۹)

حدیث طیر سے بھی یہی کچھ سامنے آتا ہے۔ آپؐ نے بارگاہِ خداوندی میں دعا مانگی تھی: اے خدایا! اپنی مخلوق میں سے محبوب ترین لے آ، جو میرے ساتھ یہ پرندہ تناول کرے۔ آپؐ کی دعا قبول ہوئی اور فوراً حضرت علیؑ آئے اور آپؐ کے ساتھ وہ

پرندہ تناول فرمایا۔ اس امر پر کثرت کے ساتھ احادیث موجود ہیں۔

اپنے موضوع کو آگے بڑھاتے ہوئے یہ عرض کریں گے: حضرت امام علیؑ نفسِ رسولؐ تھے۔ آیتِ مباہلہ اس موضوع پر دال ہے۔ اس بات میں بھی کوئی شک نہیں ہے۔ ختم نبوت ایک ایسی فضیلت ہے جو کامل و اکمل اور اتم فضیلت ہے اور ایسا مقام ہے جو ہر اعتبار سے پُرعظمت ہے۔ امام علی علیہ السلام کی امامت اسی ختم نبوت کے ساتھ متصل ہے۔ یہ امامت ہی اپنے مدارج کے لحاظ سے ہر درجہ امامت سے ارفع واعلیٰ ہے۔ یہ وہ امامت ہے جو حضرت ابراہیمؑ کی امامت سے بھی زیادہ عظیم ہے۔

امام علی علیہ السلام کا مقام ہر مقام سے بلند وبالا ہے کیونکہ آپؑ نفسِ رسولؐ ہیں۔ آپ کو یہ خصوصیت بھی حاصل ہے کہ آپؑ کی امامت ختم نبوت سے متصل ہے۔ جس طرح ختم نبوت رسولؐ اللہ کی ذات میں قائم ہے۔ اس طرح امامت علیؑ بھی آپؑ کی ذات میں قائم ہے۔ ختم نبوت کا قیام رسولؐ اللہ کے دم سے ہے اور امامت کا قیام بھی اسی صورت میں امام علی علیہ السلام کے دم سے ہے۔

ایک دوسری جہت حضرت سیدہ زہراءؑ بضعہ رسولؐ اللہ ہیں تو اس اعتبار سے آپؑ تمام انبیاءؑ سے افضل ہیں۔ آپؑ ان پر حجت ہیں جیسا کہ روایات میں موجود ہے۔ آپؑ سوائے حضرت رسولؐ اللہ اور حضرت امام علیؑ کے باقی تمام پر حجت ہیں، اس لیے رسولؐ خدا نے فرمایا تھا:

لَوْلَا عَلِیٌّ لَمْ یَکُنْ لِفَاطِمَةَ کُفْوٌ آدَمَ فَمَنْ دُوْنَهٗ

"اگر علیؑ نہ ہوتے تو بنو آدمؑ میں ان کا کوئی کفو نہ ہوتا"۔

لیکن آپؑ امام علی علیہ السلام سے افضل نہیں ہیں، اگر آپؑ بضعہ رسولؐ ہیں تو امام علیؑ نفسِ رسولؐ ہیں۔ آپؑ امام ہیں اور ان کی اطاعت حضرت زہراءؑ پر بھی واجب تھی۔ آپؑ رسولؐ اللہ کی طرح اللہ کے نزدیک اس کی پوری مخلوق سے محبوب ترین

ہیں۔ یہ بات ریب وشک سے خالی ہے۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ رسولؐ اللہ اُس سے محبت کرتے تھے جس سے اللہ محبت کرے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سب سے منتخب مخلوق کو خلق فرمایا تو اس کو اپنی محبت کا مرکز ٹھہرایا۔ اس کو محترم ومکرم فرمایا۔ یہی صفوت نور پروردگار ہے۔ اسی نور سے حضرت رسولؐ اللہ حضرت امام علیؑ، حضرت سیدہ زہراءؑ ہیں۔ رسولؐ اللہ کی بارگاہ میں تمام مخلوق سے محبوب ترین یہی دو امام علیؑ اور حضرت سیدہ فاطمہؑ تھیں کیونکہ آپ دونوں اسی نور سے تھے۔ جب یہ نور حضرت علیؑ میں متجلی ہوا تو آپؑ نے اس نور سے وہ صفات اور خصوصیات کسب کیں جو ایک امامؑ کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔

رسولؐ اللہ کی محبت کا مرکز وہ نور تھا جس نور سے یہ دونوں تھے۔ اسی لیے تمام مخلوق میں آپؐ کے نزدیک اگر کوئی محبوب ترین تھے تو یہ دونوں تھے۔ سیدہ زہراءؑ بضعہ رسولؐ تھیں تو امام علیؑ نفسِ رسولؐ تھے۔ رسولؐ اللہ کا یہ فرمانا کہ پوری کائنات میں حضرت زہراءؑ ان کے نزدیک محبوب ترین ہیں تو آپ کا یہ قول اس قول کی نفی نہیں کرتا جس میں آپؐ نے فرمایا: اگر کوئی میرے نزدیک محبوب ترین ہے تو وہ علیؑ ہیں۔ کیونکہ وہ دونوں اسی نور سے تھے۔ وہی نور ان دونوں میں چمکا۔ اسی وجہ سے وہ دونوں محبوب ترین تھے۔ لیکن امام علی علیہ السلام کو جو خصوصیت حاصل تھی وہ امامت تھی۔ امامت کی ضوفشانیاں آپؑ میں جلوہ گر تھیں۔

❋......❋......❋

ساتواں حصّہ

شہادت آئمہ طاہرینؑ

ہمارا ہر فرد شہید ہے تلوار سے یا زہر سے

سوال آپ اس حدیث کی صحت کے بارے میں کیا فرمائیں گے: اِنَّہٗ لَیْسَ اَحَدٌ مِنْ اَھْلِ الْبَیْتِ اِلاَّ وَقَدْ مَاتَ شَہِیْدًا اِمَّا بِالسَّمِ اَوْ بِالسَّیْفِ، ''ہمارے اہلِ بیتؑ میں سے ہر ایک فرد نے شہید ہونا ہے زہر سے یا تلوار سے''۔

جواب اس موضوع پر بہت سی روایات موجود ہیں جو اپنی سند کے اعتبار سے معتبر ہیں۔ ان میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

① تمیم قرشی نے اپنے والد سے، اُس نے احمد بن علی انصاری سے، اُس نے ابوصلت ہروی سے، اُس نے امام رضاؑ سے سنا، آپؑ نے فرمایا: لوگ غلط کہتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام قتل نہیں ہوئے بلکہ لوگوں کو شبہ ہوا ہے۔ قسم بخدا امام حسینؑ کو شہید کیا گیا اور جو اُن سے بھی ارفع و اعلیٰ تھے، یعنی جناب امیر المومنین علی بن ابی طالبؑ اور امام حسنؑ بن علیؑ وہ بھی شہید کیے گئے۔ نہیں ہے ہم میں سے مگر وہ مقتول ہے اللہ کی قسم! مجھے بھی زہر سے شہید کیا جائے گا۔ (عیون اخبار الرضاؑ، ج ۲، ص ۲۰۳۔ البحار، ج ۳۹، ص ۲۷ و ۲۱۳)

② محمد بن موسیٰ بن متوکل نے علی بن ابراہیمؒ سے، اُس نے اپنے باپ سے، اُس نے ابوصلت ہروی سے، اُس نے کہا: میں نے امام رضا علیہ السلام سے سنا، آپؑ

نے فرمایا:

وَاللّٰهِ مَا مِنَّا اِلَّا مَقْتُوْلٌ شَهِيْدٌ

''اللہ کی قسم! ہمارا ہر فرد شہید ہے'' (یعنی اس نے قتل ہونا ہے)

③ محمد بن حسن صفار نے احمد بن محمد سے، اس نے حسن بن سعید سے، اس نے قاسم بن محمد سے، اس نے علی سے، اس نے ابوبصیر سے، اس نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے، آپؑ نے فرمایا: رسولؐ اللہ کو خیبر میں زہر دیا گیا تھا اور گوشت نے آپؐ سے گفتگو کی تھی: یارسولؐ اللہ! میں زہر آلود ہوں۔ امامؑ نے اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا: رسولؐ اللہ نے اپنے وقتِ وصال فرمایا: میرا وقتِ وصال ہے اس لقمہ سے جو میں نے خیبر میں تناول کیا تھا۔ کوئی نبی اور اس کا وصی ایسا نہیں جو شہید نہ ہوا ہو۔ (بصائر الدرجات، ص ۵۲۳)

④ جناب شیخ صدوق رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد تمام گیارہ آئمہ شہید کیے گئے۔ جو تلوار سے شہید ہوئے۔ وہ جناب امیرالمومنینؑ ہیں اور حضرت امام حسینؑ ہیں باقی سب زہر سے شہید کیے گئے اور انھیں ان کے زمانے کے طاغوتوں نے شہید کیا۔

⑤ فزارتی نے محمد بن وهبان بصری سے، اس نے داؤد بن ہیثم سے، اس نے اسحاق بن بہلول سے، اس نے طلحہ بن زید سے، اس نے زبیر بن باطا سے، اس نے عمیر بن ہانی سے، اس نے جنادہ بن اُمیہ سے۔ حضرت امام حسنؑ نے اپنی مرض کے وقت فرمایا تھا: اس مرض میں جس میں آپ کی شہادت ہوئی تھی، یہ رسولؐ اللہ کی طرف سے ہمارے لیے عہد ہے۔ یہ امر علیؑ اور فاطمہ زہراؑ کی اولاد ہیں جو امام اثنا عشر میں جاری ہے۔ ہم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے مگر اس نے مسموم ہونا ہے یا مقتول۔ (کفایۃ الاثر، ص ۲۲۶، ۲۲۷۔ صراط مستقیم، ج ۲، ص ۱۲۸، الانوار البهیۃ، ص ۳۲۲)

۶ علامہ طبرسی اور علامہ اربلی نے فرمایا: امام حسن عسکریؑ کا فرمان ہے: ہمارے اکثر اصحاب اس دنیا سے مسموم رخصت ہوئے۔ اس طرح ان کے والد اور دادا بھی اسی طرح تمام آئمہ اس دنیا سے چلے تو شہادت کے ساتھ چلے۔ لوگوں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کے اس فرمان: وَاللّٰهِ مَا مِنَّا اِلَّا مَقْتُوْلٌ اَوْ شَهِيْدٌ سے استدلال کیا ہے۔

۷ حسین بن محمد بن سعید خزاعی عبدالعزیز بن یحییٰ جلودی سے، اس نے جوہری سے، اس نے عتبہ بن ضحاک سے، اس نے ہشام بن محمد سے، اس نے اپنے والد سے، اس نے کہا: حضرت امام حسنؑ نے اپنے والد بزرگوار کی شہادت پر خطبہ دیا: مجھے اپنے حبیب نانا بزرگوار رسولؐ اللہ نے فرمایا: اُن کے اہلِ بیتؑ کے بارہ فرد جو سب کے سب امامؑ ہیں، ہم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے مگر اس نے مقتول ہونا ہے یا مسموم۔ (بحار، ج ۲۷، ص ۲۱۷ و کفایۃ الاثر، ص ۱۶۲ و مستدرک سفینۃ البحار، ج ۱، ص ۱۶۴، طبع ۱۴۰۹ھ، ایران)

مزید اضافہ کے لیے عرض ہے: ہمارے پاس روائی اور تاریخی نصوص موجود ہیں جو ہر امامؑ کے بارے میں ہیں۔ ہر امام شہید ہوا ہے۔ اپنے اپنے زمانے کے طاغوتوں کے ہاتھوں تلوار سے یا زہر سے ان کی شہادت ہوئی ہے۔ اس امر کی حفاظت کی گئی خواص کے علاوہ کسی اور کو مطلع نہیں کیا گیا تھا کیونکہ اس میں مصالح تھے۔ اگر مزید ضرورت ہے تو ہماری کتاب مختصر مفید کی طرف رجوع کریں۔ (ج ۳، ص ۹۸)

سوال کیا کربلا صرف غم و حزن کا نام ہے یا ایک سیاسی عظیم الشان کارنامہ ہے یا کربلا دونوں پہلوؤں کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ جب ہم منبر سے ان تفسیرات کو سنتے ہیں تو حیرانی ہوتی ہے۔ ان سوالات کے جوابات مرحمت فرمائیں۔

جواب آپ کا یہ سوال اختلاف نظر کا نتیجہ ہے۔ یہ بات صحیح ہے اور نہ وہ مقام ہے کہ فی حد نفسہ اس پر مواخذہ کیا جائے۔ اصل بات یہ ہے کہ قضیہ کربلا پر جمود کا مظاہرہ ہوتا ہے، غور و فکر نہیں کیا گیا۔

جس شخص نے قضیہ کربلا کو سیاسی نظر سے دیکھا کہ وہ ایک تاریخی اور سیاسی واقعہ ہے تو وہ اسی نظریہ کو لے کر بیٹھ گیا۔ اُس نے مزید تکلیف نہ کی اور یہی کچھ سمجھا کہ کربلا اپنے پہلوؤں میں علمی و فکری و تاریخی و سیاسی اور عسکری احوال رکھتی ہے۔ تو اس عقیدہ و فکر کے اعتبار سے وہ انھی زاویوں سے کربلا پر نگاہ رکھے گا کیونکہ انسان کسی واقعہ سے اپنے افکار کے اعتبار سے ہی مستفید ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ جس نے کربلا کو شعائر سمجھا کہ کربلا ایک عبادی عمل ہے اور جن جن لوگوں نے کربلا میں شہادتیں پائی ہیں ان پر رونا اور ان کے لیے غم کرنا واجب ہے۔ تو ایسی فکر والے لوگ کربلا سے اسی فکر کے ساتھ مربوط ہیں۔ اور وہ تمام حالات و مظاہرات میں کربلا کو صرف اور صرف غم و حزن کا ذریعہ جانتے ہیں۔ اور اس امر کو عبادت سمجھتے ہیں اور اہل بیتؑ کے ساتھ محبت و عقیدت خیال کرتے ہیں۔

ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ یہ دونوں پہلو حق و بجا ہیں۔ دونوں پہلو اساسی اور مہم ہیں۔ دونوں نظریئے اپنے اپنے مقام پر ٹھیک ہیں۔ انھوں نے کہیں کوئی ٹھوکر نہیں کھائی، کوئی خطا نہیں کی۔ ہاں ان سے اگر کوئی خطا ہوئی ہے تو وہ خطا یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں۔

ایک کہتا ہے کہ کربلا صرف اور صرف ماساۃ ہے اور دوسرے کہتا ہے: نہیں کربلا ایک سیاسی، عسکری، تاریخی اور علمی کارنامہ ہے۔ ان سب کی ایک خطا اور بھی ہے وہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے کربلا کو صرف اور صرف ان دو زاویوں سے دیکھا ہے اور انھی میں بند کر دیا ہے۔ لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے کربلا کو سمجھا

نہیں حالانکہ کربلا مکمل اسلام ہے اور اس کے مختلف شئون ومجالات ہیں۔ کربلا کو محدود ومحصور کرنا صرف ایک دو پہلوؤں میں جرم ہے۔ کربلا وہ عظیم الشان مرکز ہے جہاں متلاشیانِ حق وحقیقت کی تشنگی کے تمام سامان موجود ہیں۔ کربلا ہدایت ورہنمائی کا وہ (ملکوتی) نظام ہے جہاں صاحبانِ عقل ودانش کو ہدایت ربانی کا نور ملتا ہے۔

کربلا عقائد اسلامی کا مرکز ہے ۔۔۔۔ کربلا شریعت ربانی کا مرکز ہے ۔۔۔۔ کربلا سیاسیات اسلامی کا مرکز ہے ۔۔۔۔ کربلا مطالب ومفاہیم کا مرکز ہے ۔۔۔۔ کربلا کتاب اللہ کی تفسیر وتاویل کا مرکز ہے ۔۔۔۔ کربلا امامت کی امانت اور ریحانِ نبوت کا مرکز ہے ۔۔۔۔ کربلا انبیاءؑ واوصیاءؑ اور ان کی قربانیوں کا مرکز ہے ۔۔۔۔ کربلا علوم آئمہؑ کی تجلیات اور ان کے درجات وکرامات کا مرکز ہے ۔۔۔۔ کربلا انسان کو اسلامی اور روحانی بنانے کا مرکز ہے ۔۔۔۔ کربلا عواطف انسانی اور احساسات کا مرکز ہے ۔۔۔۔ کربلا شعور وتربیت اور طہارت کا مرکز ہے ۔۔۔۔ کربلا تعمیر وتکمیل انسانیت کا مرکز ہے۔

اگر سیاسی نظریات تلاش کرنا چاہیں تو وہ آپ کو کربلا میں ملیں گے۔ اگر عقیدہ الٰہی کا فہم حاصل کرنا چاہیں تو وہ بھی آپ کو کربلا میں ملے گا۔ کربلا ہر پہلو کی امین ہے، چاہے وہ سیاسی ہو یا عقائدی، اخلاقی ہو یا دینی ہو، یا انسانی۔

کربلا نہ صرف تاریخی حادثہ ہے، نہ صرف سیاسی وعسکری عظیم واقعہ ہے، نہ صرف ماساۃ ہے۔ اس میں آفاقیت ہے۔ اس کے اندر ہر وہ پہلو ہے جو انسان کو اپنے خالق سے مربوط کرتا ہے۔

کربلا وہ مقام ہے جس کے اندر امام حسینؑ مدفون ہیں جن کے بارے نبی عظمؐ نے فرمایا تھا:

إِنَّ الْحُسَيْنَ مِصْبَاحُ هُدىً ، وَسَفِينَةُ النِّجَاةِ

"حسینؑ ہدایت کا چراغ ہے اور نجات کا سفینہ ہے"۔

حسینؑ وہ چراغ ہدایت ہے جو گم کشتگان راہ کو صراط مستقیم کی راہبری کرتا ہے۔

حسینؑ ایک نہج ہے۔ اگر اللہ تک پہنچنا ہے تو اسی نہج کو اپنانا ہوگا۔

حسینؑ ایک عقیدہ ہے اگر نظامِ پروردگار کو اپنانا ہے۔ تو اسی حسینؑ کو لازم کرنا ہوگا۔ ہمیں حسینی غرض وغایات اور ان کے ضوابط کو پیش کرنا ہوگا تا کہ حسینی تجلیات سے یہ آفاق روشن ہو جائے۔

ان تفاصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے جس سے ہم حسینی راہوں سے بھٹک جائیں اور ناک ٹوئیاں مارتے رہیں۔ ہمیں حسینی نور کو لینا ہے جس سے رات کی ظلمت کو اپنے سے ہٹانا ہے۔

کربلا صرف تاریخ قدیم کا ایک حادثہ نہیں ہے جس پر ہم بحث کرتے رہیں۔ پھر اپنی بحث کو کتابوں کے قبرستان میں دفن کر دیں جس کی طرف کوئی بھی متوجہ نہیں ہوتا، جن کو نسیان کا دیمک چٹ کر جاتا ہے۔

ہم آخر میں یہی کچھ کہیں گے۔ کربلا ایک اکسیر ہے جو انسان کو انسان بناتا ہے اور ان کی مٹی کو سونا بناتا ہے۔ صحفِ انسانی میں حسینؑ ایک نور ہے، حسینؑ ایک معمار انسانیت ہے۔

کیا امام حسینؑ پر رونا غیر مسلموں سے لیا گیا ہے؟

سوال رونا ایک فطری امر ہے۔ بشری تقاضوں میں سے ایک تقاضا ہے۔ جب انسان کا کوئی عزیز اُس سے جدا ہوتا ہے تو رونا خود بخود آتا ہے۔ جب کسی عزیز کی یاد ستاتی ہے تو انسان رو پڑتا ہے۔ کسی بچھڑے ہوئے عزیز سے ملاقات ہو تو پھر بھی آنکھوں

میں آنسو آجاتے ہیں۔ بشر چاہے مومن ہے یا کافر، جب اسباب فرح و حزن سے اُس کا واسطہ پڑتا ہے تو انھیں اسباب کے مطابق روتا بھی ہے، ہنستا بھی ہے، خوش بھی ہوتا ہے اور پریشان بھی ہوتا ہے۔

میرا گمان تو یہ ہے یہ سوال صرف بکا سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ اس سوال سے مراد مراسمِ عاشورا ہیں کہ کیا وہ اس فریق سے ماخوذ ہیں یا اُس سے یا کچھ اور ہے؟

جواب اس سوال کا جواب یہ ہے:

① اگر غیر مسلموں سے بھی لیا گیا ہو تو کیا رونے کا کسی عقیدہ سے تعلق ہے یا رونا کسی کی ضلالت و انحراف پر دلالت کرتا ہے۔ تو پھر رونے سے انکار کر دیا جائے۔ حالانکہ رونا تو ایک امر عادی ہے۔ کیفیت کے اظہار کا نام ہے۔ یہ تو ایک ایسا امر ہے جس کا نہ تو رنگ ہے نہ ذائقہ اور نہ بُو۔ مزید بات کو آگے بڑھاتے ہوئے یہی عرض ہے: اس طرح بہت سی اشیاء ہیں جن کو عالمِ بشریت اپنے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ جہاں غیر مسلم استعمال کرتے ہیں وہاں مسلم بھی استعمال کرتے ہیں۔ آج کے دور میں ہوائی جہاز ہے، بسیں، کاریں، ٹیلی ویژن وغیرہ بہت سی اشیاء ہیں۔ ان کے علاوہ بھی اور وسائل ہیں۔ ان کو غیر مسلم استعمال کرتے ہیں تو مسلمانوں کو چاہیے کہ ان وسائل کا استعمال ترک کر دیں کیونکہ ان وسائل کو اہلِ ضلال استعمال کرتے ہیں۔ انھیں چاہیے کہ اس طرح کی ایجادات کریں اور ان غیر مسلموں کی اختراعات کا استعمال چھوڑ دیں۔

جب یہ اہلِ ضلال کسی مصیبت سے دوچار ہوتے ہیں تو اپنے ملک کے پرچم کو سرنگوں کرتے ہیں اور اپنی موٹر کاروں وغیرہ پر سیاہ اشارے وضع کرتے ہیں یا

ٹیلی ویژن پر اُسے نشر کرتے ہیں یا علامات پیش کرتے ہیں۔ جب وہ فتح کو ظاہر کرتے ہیں تو اپنے ہاتھ سے وکٹری (کامیابی) کا نشان بناتے ہیں تو اہلِ اسلام کو چاہیے کہ ایسی علامات و کیفیات اپنے اُوپر حرام قرار دیں۔

۲ ان کا کہنا کہ عاشورا محرم کے مراسم حزن غیر مسلموں سے لیے گئے ہیں۔
یہ صرف ان کا دعویٰ ہے سوائے ان کے اندازوں کے اور کچھ نہیں ہے یا پھر انھیں غیب سے خبریں ملتی ہیں جن کی بنا پر جو کچھ ان کے منہ میں آتا ہے، کہہ دیتے ہیں: لا یغنی من الحق شیئًا۔ یہ لوگ باطنی حسد کی بنا پر ایسا کہتے ہیں، ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اگر اہلِ حق چاہیں تو ان کے حسد و کینہ سے اُٹھنے والی تمام آوازوں کا، ان کے لہجے میں جواب دے سکتے ہیں لیکن اہلِ حق ہمیشہ ایسی گفتگو کرتے ہیں جو شائستہ اور مہذب ہوتی ہے۔ خداوند تعالیٰ ہمیں قول و فعل کی لغزشوں سے محفوظ رکھے۔

کیا شہداء پر گریہ کمزوری کی علامت ہے؟

سوال کیا امام حسین علیہ السلام پر رونے والے کا درجہ وہی ہے جو آپؑ کے ساتھ کربلا میں شہید ہونے والے کا درجہ ہے؟
حضرت رسول اکرم کا حضرت حمزہؑ ، حضرت جعفر طیارؑ اور اپنے فرزند حضرت ابراہیمؑ پر رونا کیا یہ بھی ضعف کی علامت ہے؟

جواب اپنے کسی عزیز کی جدائی پر رونا اور کسی حبیب کی ملاقات پر خوش ہونا یہ انسانی صفات میں سے ہے اور یہ اس امر پر دلیل ہے کہ ایسا انسان اپنے شعور و احساسات کے ساتھ زندہ و سلامت ہے۔ وہ اسی لیے تو رو رہا ہے کہ اس کے اندر جو خداوند تعالیٰ نے صلاحیتیں تخلیق کی تھیں وہ محفوظ ہیں۔ ان کی بنا پر اس کے احساسات و جذبات زندہ ہیں۔ اسی کا نام زندگی ہے اور اسی کا نام عقل و دانش ہے۔

یہ تو صرف ایک عام انسان کی بات ہے۔ اب اگر کوئی انسان خالص و مخلص اور مومن ہے تو اس اعتبار سے اُس کی یہ انسانی صفات و عواطف توانا و مکمل ہوتے جاتے ہیں اور انسان اپنی انسانیت میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ یہی وہ انسانی تقاضے تھے، احساسات و جذبات تھے جن کی بنا پر انبیاءؑ و اوصیاءؑ تمام لوگوں سے بہت زیادہ حساس تھے۔ ان کے اندر محبت و ہمدردی کے جذبات ازحد تھے کیونکہ وہ حق سے بہت زیادہ قریب تھے اور حق کا دفاع کرنے میں بہت زیادہ سخت تھے۔

یہ عواطف یہ مشاعر یہی احساسات اولیاء اللہ ہیں۔ عام لوگوں سے بہت زیادہ تھے۔ اب ایسے عظیم لوگوں کے بارے میں کہا جائے کہ ان میں تردد تھا۔ ان میں باطل کی طرف میلان تھا۔ یہی امر ہمارے لیے توضیح و تفسیر کرتا ہے۔ حضرت امام حسینؑ اپنی اولاد کے ساتھ اپنے اعزا کے ساتھ بہت زیادہ محبت کرتے تھے کیونکہ آپؑ کے اندر انسانی تقاضے، انسانی احساسات بہت زیادہ تھے لیکن حق کی حمایت کے لیے اللہ کے اور مستضعفین کے لیے یہ محبت کے جذبات آپؑ کو روک نہ سکے کہ اپنے ان جوانوں کو اپنے پیاروں کو میدانِ جنگ میں نہ بھیجو لیکن آپؑ یکے بعد دیگرے اپنے ان عزیزوں کو میدان میں بھیج رہے تھے۔

یومِ عاشورا حضرت امام حسینؑ نے میدانِ جنگ میں استغاثے بلند کیے تھے:

الا هل من ناصرٍ ینصرنا، الاهل من مغیث یغیثنا، الاهل من ذاب یذاب عن حرم رسول الله۔ آپؑ کے یہ استغاثے کمزوری دکھانے اور دشمن کو تسلیم کرنے کے لیے نہ تھے۔ آپؑ یہ نہیں فرما رہے تھے: لوگو! آؤ مجھے قتل ہونے سے بچالو۔ میرے نفس کو نجات دلواؤ۔ بلکہ آپؑ کے استغاثے یہ بتاتے ہیں آپؑ اپنی طاقت کا مظاہرہ فرما رہے تھے۔ آپؑ دشمن کو بتا رہے تھے میں اکیلا ضرور ہوں لیکن کمزور نہیں ہوں۔ اور میں تم سے جنگ کرنے پر مستعد ہوں۔ آپؑ کا اعلان دشمن کے

لشکر پر واضح تھا۔ آپؑ اپنے موقف پر مصر تھے۔ اپنے عقیدہ اور اپنے دین سے اپنی وفاداری کا اعلان کر رہے تھے اور واجبات الٰہی اور واجبات انسانی کے قیام کے لیے بڑھ چڑھ کر اپنے فرائض ادا کر رہے تھے۔

امام حسینؑ پر رونا ضعف کی دلیل نہیں بلکہ قوت کی دلیل ہے۔ وہ اللہ کے سامنے جھکے اور پوری کائنات سے کٹ کر اسی کے ہو کر رہے۔ اللہ نے انھیں ہمیشہ کی زندگی عطا فرمائی جو ختم ہونے والی نہیں ہے۔

حضرت امام مہدیؑ اور میراث امام حسن عسکریؑ

سوال کسی ناصبی کے بقول حضرت امام حسن عسکریؑ کی میراث ان کی زوجہ اور بھائیوں نے حاصل کی تھی۔ اس اعتبار سے شیعوں کے پاس امام مہدیؑ کے وجود پر کوئی دلیل باقی نہیں رہی۔ اگر ان کے بیٹے محمد مہدی ہوتے تو وہ اولیٰ بالارث تھے۔

جواب پہلی بات تو یہ ہے کہ امام حسن عسکریؑ کی میراث غاصب حکمران کے ہاتھوں تقسیم ہوئی جو امامؑ کا دشمن تھا اور امام مہدیؑ کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ اب ان حالات میں امام محمد مہدی عجل اللہ الشریف کو اپنے والد بزرگوار کی میراث کا نہ ملنا دلیل نہیں ہے کہ آپؑ موجود نہیں ہیں۔ غاصب و ظالم اور جابر حکمران اپنے آپ کو امامت و خلافت کا حق دار سمجھتا تھا۔ اس لیے اس نے امام حسن عسکریؑ کو قید و بند میں رکھا اور ان کو سخت نگرانی میں رکھا اور یہ ظالم و جابر جس سیرت و کردار کا مالک تھا وہ تاریخ میں محفوظ ہے۔ وہ ایک شرابی، جوا کھیلنے والا، طنبوروں سے کھیلنے والا اعلانیہ فسق و فجور کرنے والا اس کی موجودگی میں امامؑ کی میراث کس صورت میں تقسیم ہو سکتی تھی۔ یہ بات ظاہر ہے ظالم حکمران نے اپنی مرضی سے جائداد امام تقسیم کی تھی۔ یہ سب کچھ کتب میں موجود ہے۔ (البحار، ج ۵، ص ۳۲۷-۳۳۴، ۲۲۸ تا ۲۳۲ و ج ۴۷، ص ۸،

اکمال الدین الارشاد مفید، ص ۳۲۵۔ اعلام الوریٰ، ص ۳۵۴، تاریخ سامرا، ج ۲، ص ۲۵۶، الاحتجاج، ج ۲، ص ۲۷۹)

امامؑ کے برادر جعفرؑ نے امامؑ کی میراث حکومتی ذرائع سے لے لی تھی۔

دوسری بات یہ ہے جو اکمال الدین میں موجود ہے جب امام حسن عسکریؑ کی شہادت ہوئی تو آپؑ کی نماز جنازہ پڑھنے کے لیے ان کے بھائی جعفر بن علیؑ آگے بڑھے۔ جب اُس نے تکبیر کا ارادہ کیا تو ایک چاند سا چہرے والا بچہ آگے بڑھا۔ اُنھوں نے جعفر بن علیؑ کی چادر کو کھینچا اور فرمایا: اے چچا! پیچھے ہٹو میں اپنے والد گرامی پر نماز پڑھنے کا زیادہ استحقاق رکھتا ہوں۔ جعفرؑ ایک طرف ہو گیا۔ اُس بچے نے امامؑ کی نماز جنازہ پڑھی اور اُنھیں ان کے والد کے ساتھ اُسی کمرے میں دفن کیا۔

تیسری بات یہ ہے کہ جناب شیخ مفیدؒ نے فرمایا: حضرت امام حسن عسکریؑ کے ظاہری ترکہ پر جعفر بن علیؑ نے قبضہ کر لیا تھا۔ اُس نے مزید برآں یہ کوشش بھی کی کہ اپنے بھائی امام حسن عسکریؑ کا قائم مقام بن جائے۔ لیکن اُسے کسی نے بھی قبول نہ کیا۔ آخر کار عباسی خلیفہ کے پاس گیا کہ اُسے اس کے بھائی کا مرتبہ عطا کیا جائے اور وہ اس امر کے لیے سالانہ انھیں رقم بھی دے گا لیکن اُسے اس کاوش نے بھی کوئی فائدہ نہ دیا۔

اب اس امر کی وضاحت ہو گئی ہے کہ امامؑ کا ظاہری ترکہ جعفر بن علیؑ نے لے لیا۔ عیون المعجزات میں واقع ہے کہ ابو محمد امام حسن عسکریؑ نے ۲۵۹ ہجری میں اپنی والدہ کو حج کا حکم دیا۔ مشہور قول ۲۶۰ ہجری ہے۔ پھر آپؑ نے انھیں اسم اعظم اور مواریث سپرد کیے کہ وہ امامِ زمانؑ کے حوالے کریں گی۔

اسی بات سے اشارہ ملتا ہے کہ جعفر بن علیؑ نے آپؑ کا مال سلطان جائر کے توسط سے ہتھیا لیا اور جو مواریث امامت تھے وہ امامؑ نے اپنے فرزند امامِ زمانؑ کے حوالے کر دیے تھے۔

امام حسینؑ اور اصحاب

سوال امام حسین علیہ السلام نے اپنے اصحاب سے فرمایا تھا:
میں اپنی بیعت تم سے اٹھا لیتا ہوں۔ تاریک شب کو اپنی سواری
بنا کر چلے جاؤ۔ آپؑ نے انھیں اجازت کیوں دی؟ اگر وہ آپؑ
کو چھوڑ کر چلے جاتے کیا وہ اس امر سے معذور سمجھے جاتے؟

جواب ان کے لیے امام حسین علیہ السلام کو ان حالات میں چھوڑنا کسی صورت میں جائز نہ تھا۔ چہ جائیکہ آپؑ نے انھیں چلے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ اصل میں موضوع یہ نہیں ہے کہ ان کے مابین ایک عہد و معاہدہ ہوا تھا اور امامؑ نے وہ معاہدہ ختم کر دیا۔ اب ان کے لیے چلے جانا جائز ہو گیا تھا۔ وہ سب اس قضیہ و اچھی طرح سے سمجھ چکے تھے۔ اگر وہ آپؑ کو چھوڑ کر چلے جاتے اور پھر اسی حالت میں مارے جاتے تو انھیں وہ مقامِ شہادت نہ ملتا جو اب انھیں امام حسینؑ کے ساتھ یہ مقام ملا ہے۔ بلکہ ان کو شہید بھی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ وہ مقتول ہوتے شہید نہ ہوتے۔ کیونکہ اب ان حالات میں اُن پر عقلاً و شرعاً واجب ہو چکا تھا کہ وہ امامؑ کی حفاظت کریں، دین کا دفاع کریں اور امامؑ کے اہلِ بیتؑ کے خواتین اور بچوں کی حفاظت کریں۔ یہ موردِ عقود و تعہدات کا مورد نہ تھا۔ اگر وہ امامؑ کی بیعت میں نہ بھی ہوتے پھر بھی اُن پر نصرتِ امامؑ واجب تھی کیونکہ وہ دیکھ چکے تھے کہ امامؑ قیام کر چکے ہیں۔ امامت عدمِ بیعت سے ساقط نہیں ہوتی کہ ایک آدمی بیعت نہیں کرتا اور وہ سمجھتا ہے کہ اب امامت کے امور اُس پر نافذ نہیں اور وہ بری الذمہ ہے، یہ صحیح نہیں ہے۔ لیکن شہدائے کربلا اس نقطہ کی طرف متوجہ تھے۔ جس وقت حضرت عباسؑ کا دایاں ہاتھ قطع ہوا تو آپؑ نے فرمایا:

وَاللهِ اِنْ قَطَعتُم بِيَمِينِي اِنِّيْ اُحَامِي اَبَدًا عَنْ دِينِي
وَعَنْ اِمَامِ الصَّادِقِ الْيَقِيْنِ

"قسم بخدا! اگر تم نے میرا دایاں ہاتھ قطع کر دیا ہے تو پھر بھی میں اپنی زندگی کے آخری سانس تک دین خداوندی کی حمایت میں تلوار چلاتا رہوں گا اور اُس امام کی نصرت کرتا رہوں گا جو صادق الیقین ہے"۔

ہم یہ بھی تو کہہ سکتے ہیں امام حسین علیہ السلام نے ان سے اپنی بیعت اُٹھالی تھی۔ آپؑ یہ چاہتے تھے کہ وہ بھی جان لیں کہ اب وہ مجبور نہیں ہیں۔ اب وہ آزاد ہیں جدھر جائیں جا سکتے ہیں۔ بیعت کا قلادہ دامن گیر نہیں ہے اور آنے والی نسلیں بھی جان لیں کہ حسینیؑ اصحاب ان کی معیت میں اپنی شہادتوں تک لڑتے رہے۔ وہ اس لیے جنگ نہیں کر رہے تھے کہ بیعت کا قلادہ ان کی گردنوں میں ہے اور اب ہر صورت میں بیعت سے وفا کرنا ہے۔ بیعت والی بات تو ختم ہو گئی تھی۔ اب وہ جو امامؑ کے ساتھ دشمن سے لڑ رہے تھے تو صرف اپنے شرعی وظیفہ کو سامنے رکھے ہوئے تھے۔ بیعت کی حیثیت تو شریعت کے ساتھ ہے۔ جہاں شریعت نہ ہو، بیعت ہو تو بیعت کچھ بھی نہیں ہے۔ اصل شریعت ہے۔ جب حضرت علیؑ حضرت زہراؑ کے ساتھ انصار کے پاس اپنے حق کے لیے تشریف لے گئے تھے تو اُنھوں نے ان الفاظ میں معذرت پیش کی تھی کہ وہ آپ کے آنے سے قبل بیعت کر چکے ہیں۔ اب بیعت کو توڑا نہیں جا سکتا۔

حالانکہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ غاصب کی بیعت شرعاً حرام ہے۔ بیعت امر الٰہی کو ختم نہیں کر سکتی حالانکہ یہی لوگ خم غدیر میں امام علی علیہ السلام کی بیعت سقیفہ سے قبل کر چکے تھے۔

حضرت امام حسینؑ نے جب اپنے اصحاب میں اعلان کیا کہ میں نے تم سے اپنی بیعت اُٹھالی ہے تو اس سے آپؑ آئندہ آنے والی نسلوں کو بتا رہے تھے کہ میرے اصحاب نے میری نصرت کی ہے۔ میرے دشمن کے خلاف جنگ کی۔ ان کی نصرت،

ان کا یہ جنگ کرنا صرف بیعت کی وفا کے لیے نہ تھا۔ ذاتی تعلقات کی بنا پر نہیں قوم و قبیلہ کے اعتبار سے نہیں، رشتہ داری کی بنا پر نہیں، وعدہ خلافی کے الزام کے خوف سے نہیں تھا بلکہ وظیفۂ شرعی کی بنا پر تھا۔

آپؑ نے اپنے اصحاب کے علاوہ اپنے اہلِ بیتؑ سے بھی بیعت اُٹھالی تھی۔ انھیں بھی اجازت دے دی تھی کہ وہ اپنی جانوں کو بچانے کے لیے جاسکتے ہیں۔ رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان ظالموں کے ظلم سے بچ سکتے ہیں۔ آپؑ نے اپنے اس فرمان سے اشارہ کیا تھا۔ یہ تاریک رات تمھیں ڈھانپ لے گی اور اس کو سواری بنا کر چلے جاؤ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ تم پر یہ جنگ ضروری نہیں ہے اور مرنے کے سوا کوئی اور خیار تمہارے لیے باقی نہیں ہے۔ اور نہ تم ایسے محاصرہ میں ہو جس سے بچ کر نکلنے کے تمام امکانات ختم ہو گئے ہوں۔ اسی طرح خود امام حسینؑ بھی رات کی تاریکی سے استفادہ کر سکتے تھے۔ آپؑ دشمن کی نگرانی سے بچ بچا کر جا سکتے تھے۔ پھر دشمن آپؑ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اس طرح عربوں کا ایک جنگی طریقہ رہا ہے۔ دن کو جب وہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے پڑاؤ ڈالتے ہیں لیکن ان کا ایک فریق رات کی تاریکی میں ایک ایسی جگہ چلا جاتا جس تک دوسرے فریق کی رسائی ناممکن ہو جاتی۔ جب دن ہوتا تو وہ اپنے مدمقابل کو نہ پاتے تو ان کے تعاقب میں نکلتے لیکن ان کو تلاش کرنا ان کے لیے ایک سنگین ترین امر بن جاتا۔

آخر میں ہم یہی کچھ کہیں گے کہ امام حسینؑ کے اس موقف نے اصحابِ حسینؑ کی بصیرت اور مدارج ایمانی میں بے پناہ اضافہ کیا۔ اسی موقف نے ان کے ارادوں کو مضبوط کیا۔ ان کی قوت کو دگنا کیا، ان کی شجاعت اور جذبوں کو رفعت عطا کی۔

ان تمام احوال کو سامنے رکھتے ہوئے یہی کچھ کہیں گے اگر وہ اصحاب میدانِ

جنگ سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے میدان سے نکلنے کی کوشش کرتے اور مارے جاتے تو اس صورت میں مقتول ہوتے شہید نہ ہوتے۔

امام حسین علیہ السلام کسی کو دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتے تھے کہ کوئی ایک فرد امامؑ اور دین خداوندی کے دفاع میں نہیں لڑنا چاہتا اور وہ اہلیت ہی نہیں رکھتا۔ ان مدارج کی اور ان مقامات کی جو ان شہداء کو نصرت حسینؑ میں شہادت پانے کے بعد ملنے والی ہے۔ اور یہ جنگ ایک مقدس ترین جنگ ہے۔ اس کے شہداء کائنات کے افضل ترین شہداء ہیں۔

والسلام علی الحسینؑ وعلیؑ علی بن الحسینؑ وعلی اولاد الحسینؑ وعلی اصحاب الحسینؑ

"حسینؑ آقا پر سلام، امام علی بن حسینؑ پر سلام، حسینؑ آقا کی اولاد پر سلام اور اصحاب حسینؑ پر سلام"۔

دماغی موت کے احکام

سوال جب انسانی دماغ اپنا کام چھوڑ دے اور اُس کے باقی اعضاء اپنا کام کر رہے ہیں تو اس صورت میں کیا جائز ہے؟ کیا باقی اعضاء کو موقوف کرنا جائز ہے؟

جواب دماغی موت کی صورت میں جسم کے باقی اجزاء کو موقوف کرنے میں اشکال ہے۔ دماغ کی موت باقی جسم کی موت نہیں ہے۔ ان حالات میں موت کے احکام نافذ نہیں ہوتے۔ کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ ایسے شخص کو جو ان حالات سے دوچار ہو، اُسے اپنی بقیہ حیات سے محروم کر دیا جائے۔

دماغی موت کی صورت میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک مریض کی حیات ہے۔ ایسا انسان یا تو اپنے اعمال کی سزا بھگت رہا ہے اور یا یہ تکلیف اُس کے گناہوں کا

کفارہ بن رہی ہے یا اُس کے ثواب میں اضافے کا سبب بن رہی ہے۔

اس بارے میں مزید کہوں گا کہ اس مریض کی یہی صورت حال ایک دن اللہ کی رحمت کو پالے یا کسی مومن کی دعا سے یا صدقہ کے ذریعے اس کی یہ صورت ختم ہوجائے۔ اس کی موت ٹل جائے اور زندگی واپس آجائے۔

بسا اوقات یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ انسان میں زندگی کی رمق باقی رہ جاتی ہے اور باقی جسمانی اعضا دل کی مدد کرتے رہتے ہیں تاکہ دل کی حرکت باقی رہے لیکن انسانی حالت اس درجہ پر پہنچ جاتی ہے کہ باقی اعضا دل کی حرکت کی محافظت نہیں کرپا سکتے۔ یہی صورت حال تدریجاً جاری رہتی ہے اور دل کی حرکت میں کمی واقع ہونے لگتی ہے۔ ایک وقت آتا ہے دل کی حرکت ختم ہوجاتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ دماغی موت کی صورت میں دل کی نبضات جاری رہتی ہیں۔ مریض زندہ ہوتا ہے۔ وہ اس صورت میں مُردہ نہیں ہوتا۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک مریض جس کا دماغ مکمل طور پر کام چھوڑ گیا لیکن اس کا دل کئی سالوں تک زندہ رہا اور اپنا کام کرتا رہا۔ اور آخر ایک دن اس کے دماغ نے کام کرنا شروع کردیا اور زندگی پھر لوٹ آئی۔ جس طرح کہ سائنس کہتی ہے کہ انسان کی موت کی صورت میں اس کی قوت سماعت کئی گھنٹوں تک زندہ رہتی ہے۔ قوتِ سامعہ دماغ کی موت کے ساتھ نہیں مرتی بلکہ زندہ رہتی ہے۔ انسانی حواسِ خمسہ میں سے قوتِ سامعہ وہ حاسہ ہے جو تمام حواس کے بعد مرتا ہے۔ یہ امر مشاہدات میں سے ہے۔ ان تمام صورتوں میں یہ ثابت ہوا کہ دماغ کی موت کے ساتھ دوسرے اجزائے انسانی اس وقت تک زندہ رہے ہیں جب تک جسم سے روح خارج نہ ہو۔

قرآن مجید کے اندر انسان کی موت اور وفات کے درمیان فرق کے اشارے موجود ہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰى اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى (الزمر:۴۲)

''موت کے وقت اللہ روحوں کو قبض کرتا ہے اور جو ابھی نہیں مرا اس کی روح نیند میں قبض کر لیتا ہے۔ اور پھر وہ جس کی موت کا فیصلہ کر چکا ہوتا ہے اُسے روک رکھتا ہے اور دوسروں کو ایک وقت تک کے لیے چھوڑ دیتا ہے''۔

اس آیت میں موت کا ذکر بھی ہے اور وفات کا ذکر بھی ہے۔ موت کا مفہوم واضح ہے۔ وفات اور توفّی کا معنی ہے: پورا پورا لینا۔ تمام عناصر حیات کا استیفاء۔ اس سے مراد یہ ہے قبض روح کے مراتب ہیں۔ جب قبض روح تامہ صورت میں حاصل ہو جائے تو موت کامل ثابت ہو جاتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا نہ کہ فرمایا: اللّٰہ یمیت الانفس۔

اہلِ کتاب سے عقد دائمی

سوال میں ایک ایسی خاتون سے عقد کرنا چاہتا ہوں جو آسٹریلیا کی رہنے والی ہے اور اہل کتاب سے ہے اور میں عقد کے بعد اس کے ساتھ آسٹریلیا اس کے ملک چلا جاؤں گا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ میں اس وقت اُردن میں ہوں اور میں نے یہاں اُس کے ساتھ عقد کرنا ہے۔ اس عقد کے صیغہ کے بارے بتائیں کہ صیغہ کے الفاظ کیا ہیں؟ اس کے علاوہ یہ فرمائیں کیا اہلِ کتاب کے ساتھ عقد دائمی ہو سکتا ہے؟ وہ اپنے مذہب پر باقی رہے گی اور میرے مذہب کا وہ بے حد احترام کرتی ہے۔

جواب اگر وہ عورت جس سے آپ عقد کرنا چاہتے ہیں وہ اپنے مذہب پر رہنا چاہتی ہے تو اُس کے ساتھ عقد دائمی نہیں ہو سکتا البتہ عقد موقت ہو سکتا ہے چاہے وہ بیس سال کے لیے ہو یا پچاس سال کے لیے ہو۔

صیغہ کے الفاظ یہ ہیں: پہلے وہ عورت کہے گی:

زَوَّجْتُكَ نَفْسِيْ عَلٰى مَهْرِ (کذا) عَشَرَةِ دَنَانِيْر لِمُدَّةِ خَمْسِيْنَ سَنَةٍ

اس کے جواب میں آپ کہیں گے: قَبِلْتُ۔

اہلِ کتاب کا ذبیحہ

سوال میرا دوسرا سوال یہ ہے کہ میں نے اُس کے ساتھ آسٹریلیا کا سفر کرنا ہے اور پھر اس کے ساتھ آسٹریلیا میں زندگی بسر کرنا ہے۔ لیکن آسٹریلیا میں مسلمان نہیں ہیں۔ اگر ہیں تو بہت قلیل تعداد میں ہیں۔ جن تک میری رسائی ممکن نہیں ہے۔ اب ان حالات میں شرعی طور پر میں ان کے ساتھ معاملات کیسے کروں اور اُن کے ذبیحہ کا کیا حکم ہے؟

جواب اہلِ کتاب کا ذبیحہ کھانا جائز نہیں ہے۔ ذبیحہ میں اسلام شرط ہے۔ اسم اللہ کا ذکر گردن کی چار رگوں کا کاٹنا شرط ہے اور یہ غیر مسلموں سے ممکن ہی نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ باقی تمام کھانے کی اشیاء کا کھانا جائز ہے لیکن اہلِ کتاب کی رطوبت سے بچنا واجب ہے اس بنا پر کہ اہلِ کتاب نجس ہیں۔

حجاب

سوال ان ممالک کی ثقافت کے اعتبار سے وہاں کی خواتین

پردہ نہیں کرتیں۔ اپنی عادت کی وجہ سے یا مسائل سے لاعلمی کی وجہ سے تو ان حالات میں عورت کو حجاب پر مجبور کرنا چاہیے یا پھر اُس کو اس امر کے لیے آہستہ آہستہ کیسے تیار کرنا چاہیے؟

جواب ضروری ہے کہ دین حق کی طرف متوجہ کرنے کے لیے مفید طریقے اپنانے چاہئیں۔ بعض اوقات صبر کرنا بھی لازم ہو جاتا ہے۔ ایسا طریقہ نہیں اپنانا چاہیے جس سے اُسے اسلام سے نفرت ہو جائے اور پھر ہدایت سے مایوسی ہو جائے لیکن بہتر ہے ایسی عورتوں سے جو اہلِ کتاب ہیں۔ ان سے اولاد پیدا نہ کی جائے کہ کہیں پھر اولاد کی صورت میں دوسرے مسائل پیدا ہو جائیں۔

گرجا گھر میں اپنی کتابیہ زوجہ کے ساتھ جانا

سوال میری کتابیہ زوجہ اپنے دین مسیحیت کو نہیں چھوڑنا چاہتی۔ کیا اُس کے ساتھ چرچ میں جانا جائز ہے کیونکہ وہ چرچ میں اُسے عبادت کے لیے جانا ہوتا ہے؟ اس کے علاوہ ایسی زوجہ مسلمان عورتوں کے ساتھ مساجد میں جاسکتی ہے تاکہ وہ دین اسلام سے قربت حاصل کرے؟

جواب اہلِ کتاب کا مساجد میں داخلہ جائز نہیں ہے۔ چہ جائیکہ وہ مسلم کی بیوی بھی کیوں نہ ہو۔ رہی بات آپ کے چرچ میں جانے کی۔ اگر ان کے مقدسات اور مذہب کا احترام وہاں چرچ میں لازم ہے اور آپ کے جانے کے ساتھ ان کے مذہب کی تائید ہوتی ہو تو پھر اپنی بیوی کے ساتھ چرچ جانا جائز نہیں ہے۔

سوال میں نے اُسے اس بات پر راضی کرلیا ہے کہ وہ ایسا لباس پہنے جس سے اس کا جسم لوگوں کے سامنے ظاہر نہ ہو لیکن میں حجاب کے مسئلہ میں متردّد ہوں۔ اس بارے میں جناب کی

کیا رائے ہے؟

جواب جی ہاں! اُس کے ساتھ نرمی لازمی ہے تاکہ وہ اسلام کی طرف میلان رکھتے ہوئے ایک دن اسلام کو قبول کر لے۔ جس دن وہ اسلام قبول کرے گی تو حجاب کو بھی قبول کرے گی۔ اس طرح اور آسانی پیدا ہو جائے گی جب اُس کے لیے اسلامی ماحول مہیا کر لیا جائے۔

بلند و بالا اخلاق و احترام

سوال یہ عورت انتہا درجے کے اخلاق کی مالکہ ہے حالانکہ میں اپنے معاشرے میں ایسے لوگ بہت کم پاتا ہوں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ یہ عورت دین اسلام کو قبول کر لے۔ لیکن ایسا تدریجاً ہو سکے گا اس کے لیے ایک لمبا عرصہ درکار ہے۔

جواب مجھے امید ہے اس اہم کام کا آپ کو ایک اجر عظیم ملے گا۔ خداوند تعالیٰ آپ کے ذریعے اس روح کو ہدایت عطا فرمائے۔ خداوند تعالیٰ آپ کی حفاظت فرمائے۔

جمع بین صلاتین

سوال میں چاہتا ہوں کہ جناب سے جمع بین صلاتین کا سوال کروں۔ ہم شیعیانِ اہلِ بیتؑ نماز ظہر و عصر اور نماز مغرب و عشاء اکٹھے پڑھتے ہیں۔ اہلِ سنت ایسا نہیں کرتے اور وہ ہمیں کہتے ہیں: تم نمازیں اپنے اوقات میں نہیں پڑھتے اور وہ کہتے ہیں سوائے سفر کے نمازوں کو اکٹھے نہیں پڑھا جا سکتا۔

کسی نے کہا: ایک آدمی نے نماز مغرب پڑھی اور مغرب کی نماز کے ساتھ عشاء کی نماز کو جمع نہیں کیا اور ان دونوں فریضوں کے

درمیان فوت ہو گیا۔ کیا ایسے شخص سے نماز عشاء کا محاسبہ کیا جائے گا؟

جواب شیعیانِ اہلِ بیتؑ نے دین خداوندی رسول اللہؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی آل سے لیا ہے۔ جب زوالِ شمس ہوتا ہے تو ظہر وعصر کی نمازوں کا وقت ہو جاتا ہے لیکن پہلے نمازِ ظہر پڑھی جائے گی پھر نمازِ عصر پڑھی جائے گی۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان ہے: جب سورج زوال کرے تو نمازِ ظہر اور عصر کا وقت داخل ہو جاتا ہے۔ لیکن پہلے نمازِ ظہر پڑھی جائے گی۔ (کافی، ج ۳، ص ۲۷۶-۲۷۷)

اس طرح آپؑ کا فرمان ہے: جب سورج غروب کرے تو نمازِ مغرب اور عشاء کا وقت ہو جاتا ہے لیکن پہلے نمازِ مغرب بعد نمازِ عشاء۔

حضرت امام رضا علیہ السلام کا فرمان بھی اسی امر پر دال ہے (کافی، ج ۳، ص ۲۸۲)۔ اور قرآن کریم میں نماز کے اوقات بیان ہوئے ہیں۔ ان اوقات کو تین وقتوں میں محدود کیا ہے:

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا (سورہ اسرا:۷۸)

زوالِ آفتاب سے لے کر رات کے اندھیرے تک نماز قائم کرو اور فجر کی نماز بھی کیونکہ فجر کی نماز کی گواہی دی جاتی ہے"۔

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ نمازِ ظہر اور عصر کا وقت مشترک ہے اور اسی طرح مغرب وعشاء کا وقت بھی مشترک ہے لیکن ظہر اور عصر سے پہلے پڑھی جائے گی اور مغرب عشاء سے قبل پڑھی جائے گی۔

اسی عنوان پر اہلِ سنت اور شیعہ کی روایات کثرت کے ساتھ موجود ہیں۔

حضرت رسول اللہؐ نے دو نمازوں کو اکٹھا پڑھا حالانکہ کوئی عذر بھی موجود نہ تھا۔ نہ سفر تھا اور نہ بارش۔

اہلِ سنت نے ایک روایت ابن عباسؓ سے نقل کی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے ظہر اور عصر کو اکٹھے پڑھا۔ اس طرح مغرب و عشاء کو بھی جمع کیا حالانکہ نہ تو کوئی خوف تھا نہ سفر تھا اور نہ بارش تھی۔ (ترمذی، ج ۵، ص ۳۹۲۔ مسند احمد، ج ۱، ص ۲۲۳، ۲۵۴۔ صحیح مسلم، ج ۲، ص ۱۵۲۔ سنن ابی داؤد، ج ۱، ص ۲۷۲۔ سنن نسائی، ج ۱، ص ۲۹۰۔ سنن کبریٰ، ج ۳، ص ۱۶۷ و ج ۱، ص ۴۹۱۔ تحفۃ الاحوذی، ج ۱، ص ۴۷۸۔ موطا، ج ۱، ص ۱۴۴)

اگر فرض کریں کہ نماز کے اوقات پانچ ہیں تو نمازِ عصر کی اس وقت سے قبل تقدیم جائز نہیں ہے۔ جبکہ ثابت ہے کہ پیغمبرؐ نے دو نمازوں کو جمع کر کے پڑھا۔ تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پیغمبرؐ نے دو نمازوں میں سے کسی ایک نماز کو اس کے مقررہ وقت میں نہیں پڑھا۔ تو اس صورت میں نمازِ عصر یا باطل ہوگی یا آپ نے اس کا اصل وقت ساقط کیا یا پھر اس کا وقت زوالِ شمس سے شروع ہو جاتا ہے لیکن عصر پر ظہر کو تقدیم حاصل ہے۔ اب تین صورتیں سامنے آئیں تو اس میں کوئی شک کی بات نہیں رہ جاتی۔

پہلی دو صورتیں باطل اور تیسری صورت باقی رہ جاتی ہے اور وہی عین ہے جو شیعیانِ اہلِ بیتؑ کہتے ہیں۔

ظہر کی نماز کی فضیلت کا وقت زوالِ شمس سے شروع ہو جاتا ہے اور اُس وقت تک باقی رہتا ہے جب تک ہر چیز کا سایہ اس کی مثل ہو جائے۔ اس طرح نمازِ عصر کی فضیلت کا وقت بھی نمازِ ظہر کی فضیلت کے وقت کے ساتھ شروع ہوتا ہے لیکن وہ اس وقت باقی رہتا ہے جب کسی شے کا سایہ دگنا ہو جائے (لیکن نمازِ ظہر کو تقدیم حاصل ہے)۔

❋......❋......❋

آٹھواں حصّہ

شخصیات

محقق طوسی رحمۃ اللہ علیہ

سوال دورانِ سفر ایک آدمی نے کہا: محدث خبیر شیخ طوسی اُمت مسلمہ کے خائن ہیں۔ انھوں نے ہلاکو خان کو دعوت دی اور سلطنتِ عباسیہ کا سقوط کرایا۔ اس بارے میں میرا سوال ہے کہ شیخ طوسیؒ کا موقف کیا تھا؟ انھوں نے ایسا کیوں کیا، تا کہ ہمارے شبہات دُور ہو جائیں؟

جواب اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ مغول ایک جرائم پیشہ قوم تھی۔ انھوں نے عظیم جرائم کا ارتکاب کیا۔ انھوں نے مسلمانوں اور مستضعفین کو ذلیل و رسوا کیا، انھیں قتل کیا اور خوب غارت گری کی۔ ان کی ان باتوں کا انکار نہیں ہے۔ جہاں تک محقق شیخ طوسیؒ کی مداخلت کی بات ہے تو آپ کا مقصد صرف اور صرف علمائے اسلام کی زندگیوں کی حفاظت تھا۔ ان کی زندگیاں شدید خطرات سے دوچار تھیں۔ آپ نے اپنی اس مداخلت سے مفکرین، فلاسفہ اور حکماء کو ہلاکت سے بچالیا۔ اگر آپ مداخلت نہ کرتے تو یہ سب اُمت مسلمہ کا قیمتی سرمایہ مغولوں کے ہاتھوں قتل ہو جاتا۔

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ نصیر الدین طوسی نے انھیں اسلام کا پیروکار بنایا اور چنگیز خان کے پوتوں کو دین کا حامی بنا دیا۔ پھر ان لوگوں نے اسلام کے نام کے ساتھ حکومت کی اور وہ اسلام کے پرچم کے سایے تلے رہنے لگے۔

اسی طرح آپ کا یہ بھی عظیم الشان کارنامہ ہے کہ آپ نے اسلامی ورثے کو ہلاکت سے بچایا۔ صرف ہلاکت سے ہی نہیں بچایا بلکہ اس کی حفاظت کی اور مغلوں کے شر سے بچایا۔ (کتاب مختصر مفید، جز اول، نمبر ۶۹)

یہی وہ اسباب تھے کہ ہلاکو خان نے آپ کو وزارت اوقاف کا قلمدان سونپا تو آپ نے مدارس علمی، درس گاہوں اور یونیورسٹیوں کے نظام کو مضبوط سے مضبوط تر کیا۔ وہاں علمائے کبار کو جمع کیا، مختلف شہروں سے حکماء و فلاسفہ کو اپنے ہاں دعوت دی اور آذربائیجان کے شہر مراغہ میں ایک عظیم الشان رصدگاہ کی بنیاد ڈالی اور اس کے پہلو میں ایک بہت بڑی لائبریری بنائی جو چار لاکھ کتب پر مشتمل تھی۔

مستشرق روڈلسن کہتے ہیں: شیخ طوسی نے ایک بہت بڑا مکتبہ قائم کیا۔ (جز اول مختصر مفید)

علامہ طوسی نے رصدگاہ مراغہ میں علماء کی ایک بہت بڑی تعداد کو جمع کیا۔ نہ صرف اپنے مسلک کے علماء کو بلکہ دوسرے مسالک کے علماء کو بھی دعوت دی۔ اس طرح مختلف ممالک اور علاقوں کے علمائے کبار جمع ہوئے۔

بعض علماء نے آپ کے بارے میں یہ کہا کہ محقق طوسی اپنی طاقت وقدرت کے لحاظ سے عظمت کے مظہر تھے۔ آپ نے ہلاکو خان کی وحشت و بربریت کو تدریجاً ختم کیا حالانکہ وہ خون پینے کا عادی تھا اور اس کی توجہ اجتماعی امور کی اصلاح کی طرف مبذول کی حالانکہ وہ تہذیبوں کو فنا کرنے والا تھا۔ آپ نے اس سے تہذیبوں اور ثقافتوں کی حفاظت کا کام لیا۔ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ ہلاکو نے فخر الدین لقمان بن عبداللہ المراغی کو ایک وفد کے ساتھ عرب بھیجا کہ ان کے علماء کو اِدھر مراغہ لے آئے۔ جو یہاں سے بھاگ کر وہاں جان بچانے کے لیے چلے گئے تھے۔ ان میں سے کچھ اِربل، موصل، شام چلے گئے تھے۔

فخرالدین ایک دانا و بینا اور مدبر شخص تھے۔ آپ اپنے حسنِ تدبر سے ان علماء کو مراغہ لے آئے۔ جناب محقق طوسیؒ نے مدارس اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کے مدارج مقرر فرمائے۔ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں لکھا ہے: خواجہ نصیرالدین طوسی ہر فلسفی کو روزانہ تین درہم، ہر طبیب کو دو درہم اور ہر فقیہہ کو ایک درہم اور محدث کو آدھا درہم روزانہ اعزازیہ دیتے تھے۔ آپ نے اس طریقہ سے لوگوں کو فلسفہ اور طب کی طرف متوجہ کیا کیونکہ اس سے قبل ان علوم کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ جب آپ نے علمائے عرب و غیرعرب کو اپنے ہاں دعوت دی تو ہر طرف سے علماء آپ کے ہاں اکٹھے ہو گئے۔ دمشق، موصل، قزوین، تفلیس اور باقی علاقوں کے علماء نے آپ کی آواز پر لبیک کہا۔

مؤیدالدین عرضی نے لکھا ہے: آپ نے علماء کو جمع کیا اور آپ نے ان پر عطا وبخشش کے دروازے کھول دیے۔ آپ ان علماء پر اتنا مہربان تھے جتنا ایک باپ اپنے بیٹے پر ہوتا ہے بلکہ اُس سے بھی زیادہ۔ پس یہ لوگ آپ کے زیرسایہ محفوظ ہو گئے اور خوشحال ہو گئے۔

عجیب وغریب بات یہ ہے کہ اس عظیم الشان محسن کے خلاف اس کے اپنے شاگرد سازشیں کرنے لگے۔ ہلاکو کو آپ کے خلاف بھڑکایا اور مخالف بنا لیا تاکہ وہ مقام حاصل کریں جو علامہ طوسی کو حاصل ہے۔ ان میں ایک قطب الدین شیرازی، محمود بن مسعود اور نجم الدین علی بن عمر صاحب متن الشمسیہ، یہ سب حاسدین تھے جو آپ کے خلاف سازشیں کرتے رہتے، حتیٰ کہ انھوں نے ہلاکو کو آپ کے قتل پر تیار کر لیا۔

جہاں تک بات ہے سقوطِ بغداد کی، تاریخی نصوص بتاتی ہیں کہ اس امر کا سب سے بڑا عامل خلیفہ عباسی اور اُس کے حاشیہ نشین ہیں جنھوں نے ہلاکو کی تحریک کو جنم دیا، تاکہ عباسی خلیفہ سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ عباسی خلافت کے تمام کارنامے تاریخ نے محفوظ کر لیے ہیں۔

اب اس سوال کا جواب کہ محقق طوسی نے ہلاکو خان کا ساتھ دیا جس کی وجہ سے سقوط بغداد ہوا۔ علاوہ ازیں کہ محقق طوسی ہلاکو کے تقدیم کی اساس تھے اور آپ نے ہلاکو کو اس کے حملہ میں کامیابی دی۔

میں نہیں جانتا کہ اس کی اس بات کو قبول کرلیا جائے۔ پہلے تو ہلاکو کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ وہ کون تھا اور کس طاقت کا مالک تھا۔ وہ ایک بہت بڑے جنگجو لشکر کا مالک تھا جو سب وحشی تھے۔ انھیں عیش و عشرت والی زندگی کا علم تک نہ تھا۔ نہ وہ آرام و سکون سے واقف تھے۔ نہ انھوں نے محلات دیکھے تھے۔ وہ سخت ترین حالات کے عادی تھے۔ ان کی زندگی ایک عسکری زندگی تھی۔ پھر جب ایک ایسا انسان جو ہدف بنالے تو وہ اپنے ہدف تک پہنچ جاتا ہے۔ اگر اس کا ہدف اسلامی حکومت کا انہدام تھا تو ادھر اسلامی حکومت کے حکمران پرتعیش زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہر قسمی مشقت سے دور رہ رہے تھے۔ ضعف اور خوف نے انھیں گھیر رکھا تھا۔ ان فاتح لشکر کے سامنے ان کی کیا حیثیت تھی۔

ادھر جناب نصیرالدین طوسی کے پاس کیا طاقت تھی جس کے ذریعے ہلاکو کی طاقت میں اضافہ ہوگیا۔ وہ خود ایک بہت بڑی طاقت کے مالک تھے۔ ہمیں سمجھ نہیں آئی، سائل کے اسی سوال سے کہ محقق طوسی نے ہلاکو کو اس کے حملہ بغداد میں کامیابی عطا کی۔ یہ لوگ جناب طوسی کے بارے اس طرح کی باتیں کس بنیاد پر کرتے ہیں۔ کیا ان کے پاس کوئی تاریخی نصوص ہیں جن کی بنیاد پر یہ باتیں بناتے ہیں یا صرف خالی کہانیاں ہیں۔ علمی بحثوں میں ایسی باتوں کی گنجائش نہیں ہے۔

مختار ثقفیؒ

سوال مختار ثقفیؒ کے بارے میں جناب کی کیا رائے ہے بالخصوص جب انھوں نے کہا: محمد بن حنفیہ "مہدی" ہیں؟

جواب ① سب سے پہلے اس بات کا جواب کہ مختار ثقفیؒ کا عقیدہ کہ وہ جناب محمد حنفیہ کو "مہدی" جانتے تھے۔ ہمارے پاس جو نصوص ہیں ان سے یہ بات ثابت نہیں ہے اور نہ ان کی طرف یہ نسبت ثابت ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ آپ نے جناب محمد بن حنفیہ کی طرف جو خط لکھا تھا اُس میں لکھا تھا: اَنْتَ مَهْدِیٌّ بِحَمْدِ اللّٰهِ کہ آپ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہدایت یافتہ ہیں۔ آپ نے یہ نہیں لکھا تھا: اَنْتَ مَهْدِیٌّ کہ آپ ہی مہدی ہیں۔ لیکن آپ کے بارے میں جو بات ظاہر ہے وہ یہ ہے: آپ کی طرف کیسانیہ کی نسبت دی گئی۔ کیسانی آپ کو اپنا رہبر خیال کرتے تھے۔ یہ امویوں اور زبیریوں کی طرف سے آپ کے قتل کے بعد نسبت دی گئی کیونکہ وہ آپ کے دشمن تھے۔

② میرا عقیدہ یہ ہے کہ مختار ثقفیؒ اہلِ بیتؑ کے سچے اور مخلص محب تھے اور ان کے اعداء سے بغض رکھنے والے تھے۔ آپ نے قاتلانِ حسینؑ کو اپنے ایمان اور صدق کی بنا پر قتل کیا۔ اس امر میں آپ کا کوئی سیاسی مقصد نہیں تھا جیسا کہ ظاہر ہے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے آپ کے لیے رحم کی دعا مانگی۔

③ تیسری بات یہ ہے: جب مختار ثقفی نے دیکھا کہ ابن زبیر حجاز کا مالک بن چکا ہے اور وہ امام علی علیہ السلام کے بارے میں اپنی عداوت میں مشہور ہے۔ اس طرح عبدالمالک بن مروان جو ابوذبان کے نام سے مشہور تھا۔ ملک شام اور مصر کا حکمران بن چکا ہے حالانکہ ان لوگوں میں کوئی فضیلت نظر نہیں آتی تھی۔ یہ لوگ نہ تو ذہین و فطین تھے اور نہ مدبر اور سیاست کار۔ اور نہ اس کے علاوہ ان میں کوئی اوصاف حکمرانی تھے۔ پھر بھی یہ لوگ حکومت کر رہے تھے۔

مختار ثقفیؒ نے ان حالات کے تناظر میں جب یہ دیکھا تو یہ سارے حکمران اُسے اپنے مقابل ہیچ نظر آئے لیکن باوجود اوصاف حکمرانی کے اس نے اپنے پاس

حکومت نہیں دیکھی تو اُس نے خونِ حسینؑ کا مطالبہ کیا اور عراق کا حاکم بن گیا۔ حسن سیاست و تدبر میں اپنی مثال آپ تھا۔ اُس نے کوفہ میں رہ کر عراقیوں سے مدد حاصل کی اور عرب کوا پنے حال پر چھوڑ دیا۔ اور پھر اس نصرت سے قاتلانِ حسینؑ سے انتقام لیا اور اپنے دشمنوں پر قدرت حاصل کی۔

④ مختار ثقفی کی ایک نگاہ زبیریوں پر تھی جو اُس وقت حجاز پر حاکم تھے اور دوسری نگاہ اموریوں پر تھی۔ جب آپ کو عراق کی حکومت ملی تو آپ نے قاتلانِ حسینؑ سے خونِ حسینؑ کا انتقام لیا۔ زبیریوں اور امویوں نے آپ کے اس عظیم الشان کام کو گناہِ کبیرہ خیال کیا جو ان کے نزدیک نا قابلِ عفو تھا۔

⑤ جب مختار ثقفی کو حکومت حاصل ہوگئی اور اُس نے اپنا کام کر دکھایا اور آپ نے اُس وقت عراقیوں کے خلاف جنگ کی اور انھیں اپنے انجام تک پہنچایا۔ وہ لوگ کتنے سطحی اور جاہل تھے۔ اس بات کا اندازہ امام حسینؑ کے قاتل کے ان الفاظ سے ہوتا ہے کہ وہ ابن زیاد کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے:

اِمْلَا رِکَابِی فِضَّۃً وَذَھَبًا
اِنِّی قَتَلْتُ السَّیِّدَ الْمُحَجَّبَا
قَتَلْتُ خَیْرَ النَّاسِ اُمًّا وَ اَبًا
وَخَیْرَھُمْ اَنْ یَنْسِبُونَ نَسَبَا

”میرے برتن کو چاندی اور سونے سے بھر دو۔ میں نے ایک بہت بڑے سردار کو قتل کیا ہے۔ میں نے اُسے قتل کیا ہے جو اپنے باپ اور ماں کے لحاظ سے تمام لوگوں سے ارفع و اعلیٰ تھا۔ جب نسب و نسل کے تذکرے ہونے لگیں تو وہ اپنے نسب کے لحاظ سے سب سے بہترین تھا“۔

جب ابن زیاد نے سنا تو اُسے کہا: جب معاملہ ایسا تھا تو پھر تو نے اُسے کیوں قتل کیا۔ آخر اُسے انعام سے محروم کر دیا۔

انھی لوگوں میں سے مختار ثقفی اُٹھے اور اپنی اطاعت پر انھیں مجبور کیا۔ یہ لطف ربانی تھا جس کی بنا پر اُسے کامیابی ملی۔ مختار ثقفی کی حکومت بنواسرائیل کے تابوتِ سکینہ کی طرح تھی۔

یہ وہ اسباب تھے جن کی بنا پر ان کی طرف گناہانِ کبیرہ کی نسبت دی گئی۔ بعد میں آنے والے لوگوں نے ان پر یقین کر لیا۔

صحابیِ رسولؐ جنابِ ابوذر غفاریؓ

سوال رسولؐ اللہ کا فرمان ہے: مَا اَظَلَّتِ الْخَضْرَاءُ وَلَا اَقَلَّتِ الْغَبْرَاءُ، ذَا لَهْجَةٍ اَصْدَقُ مِنْ اَبِي ذَرٍّ، نہ تو آسمان نے کسی پر سایہ کیا اور نہ "زمین نے کسی کو اپنی پشت پر اُٹھایا جو اپنے لب ولہجہ میں ابوذرؓ سے صادق ہو"۔

قول ظاہراً عموم پر دلالت کرتا ہے۔ یہ نبی اکرمؐ، حضرت علیؑ، امامانِ حسن و حسین علیہم السلام سب کو شامل ہے حالانکہ ان ہستیوں کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس بارے میں وضاحت فرمائیں؟

جواب اس سوال کا جواب کچھ یوں دیا جا سکتا ہے:

پہلی بات تو یہ ہے کہ خبر وہ سچی ہوتی ہے جو واقعہ کے مطابق ہو۔ ایک آدمی جو اپنی تمام خبروں میں سچا ہو اور ایک دوسرا بھی اسی کی طرح تمام اخبارات میں سچا ہو تو دونوں فضیلت میں برابر ہوں گے۔ پہلا دوسرے سے فضائل میں بڑھ نہیں سکتا۔ ایک ان دونوں میں سے اپنی کسی ایک خبر کے لحاظ سے جھوٹا ثابت ہو جائے تو دوسرا اصدق

کے لحاظ سے اس سے بڑھ جائے گا۔ صداقت کی آخری منزل خبر کی صداقت کے اعتبار سے ہے کہ وہ واقع کے مطابق ہے یا نہیں ہے۔

حضرت امام علی علیہ السلام، حضرت سیدہ زہراؑ، حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسین علیہم السلام سب صادق ہیں۔ جو کچھ فرماتے ہیں: وہ سچ ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ سب صداقت میں جناب ابوذرؓ کے مساوی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ قول صحیح ہے کہ آسمان نے کسی پر سایہ نہیں کیا اور زمین نے کسی کو اُٹھایا نہیں جو ابوذرؓ سے زیادہ سچا اور صادق ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ فرمان اللہ اور اُس کے رسولؐ کی طرف سے جناب ابوذرؓ کے لیے کیوں جاری ہوا۔ آپ کو یہ اعزاز کیوں بخشا گیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبرؐ کے بعد قریب والے زمانے میں جناب ابوذر کی تکذیب ہوتا تھی۔ بعض لوگوں نے انھیں جھٹلاتا تھا۔ اس لیے رسولؐ اللہ نے فرمادیا تھا۔ آپ کے فرمان کا مقصد یہی ہے کہ جس نے جناب ابوذرؓ کو جھٹلایا۔ اُس نے مجھے جھٹلایا۔

ہائے ان لوگوں کی جرأت ابوذرؓ تو اپنی جگہ پر رہے اُن لوگوں نے رسولؐ اللہ کی اہل بیتؑ کی تکذیب کرڈالی۔ ہم ان جرائم کبیرہ سے خدا کی پناہ چاہتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے: اگر ہم اس قول کو قولِ عام خیال کریں کہ یہ قول خود رسولؐ اللہ، حضرت علیؑ، سید زہراؑ اور امامانِ حسن و حسین علیہم السلام کو بھی شامل ہے لیکن ان حضرت کے لیے عصمت و طہارت کے دلائل موجود ہیں جو انھیں اس عمومیت سے خارج کردیتے ہیں۔ یہ ادلہ ان کی عصمت اور اصدقیت پر قائم اور حاضر ہیں۔ جتنے اقوال وارد ہوتے ہیں وہ ان کے بعد وارد ہوتے ہیں اور وہ کلام مخصوص ہوتے ہیں، عام نہیں ہوتے اور نہ مطلق وارد ہوتے ہیں۔ اس امر پر یہ روایت شاہد ہے۔

جب امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا: کیا رسولؐ اللہ نے جناب

ابوذرؓ کے بارے نہیں فرمایا؟ ما اظلت الخضرا ولا اقلت الغبرا......الخ۔ آپؑ نے فرمایا: ہاں فرمایا ہے۔ پوچھنے والے نے کہا: پھر رسولؐ اللہ، حضرت امیر المومنین اور امام حسنؑ و امام حسینؑ کے بارے میں آپ کیا فرمائیں گے؟

آپؑ نے مجھے فرمایا: سال کے کتنے ماہ ہوتے ہیں؟

میں نے کہا: بارہ ماہ ہوتے ہیں۔

پھر آپؑ نے فرمایا: محترم مہینے کتنے ہیں؟

میں نے عرض کیا: چار مہینے۔

آپؑ نے فرمایا: کیا ان چار مہینوں میں ماہِ رمضان داخل ہے؟

میں نے عرض کیا: نہیں۔

آپؑ نے فرمایا: ماہِ رمضان میں ایک رات ہے جو ہزار مہینوں سے افضل ہے۔ ہم اہلِ بیتؑ پر قیاس نہیں کیا جاتا۔ (بحار،ج ۲۲،ص ۴۰۶، ۴۰۷، معانی الاخبار،ص ۵۶)

❋......❋......❋

نواں حصّہ

متفرقات

حدیث کے قبول وتضعیف کا معیار

سوال جب اہلِ سنت کے ساتھ ہماری کوئی علمی بات ہوتی ہے اور ہم ان کی کتب صحاح سے استدلال کرتے ہیں تو کہتے ہیں: یہ روایت ضعیف ہے۔ اس کو ابنِ عقیلی یا ابنِ حبان یا ابنِ معین وغیرہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔

جب ہم ان کتب مذکورہ کے علاوہ ان کی دوسری کتب سے استدلال کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں: یہ حدیث جھوٹی ہے۔ کیا ان لوگوں کے لیے احادیث کا اس طریقے سے رد کرنا جائز ہے؟

جواب اس سوال کے جواب میں یہ کہیں گے: اہلِ سنت کا عقیدہ ہے کہ صحیح بخاری و مسلم اور ان کے علاوہ جو کتب احادیث ہیں ان کی تمام احادیث صحیح ہیں۔ اب ان پر واجب ہے۔ جب ان پر خصم ان کی اپنی کتب سے استدلال کرے تو قبول کریں۔ ان کتب میں جو روایات ہیں وہ صحیح نہیں ہیں اس لیے ان کتب سے اعتبار ساقط ہو جاتا ہے اور ان کے بہت سے علماء اس امر کے قائل ہیں اور یہی حال ان کے کتب رجال کا ہے جیسے تہذیب التہذیب وغیرہ ہیں۔

دوسری بات یہ ہے: جب ہم ان کی ذکر کردہ احادیث سے احتجاج کرتے ہیں پہلے تو وہ ان صحاح میں مذکور ہیں۔ اگر ان میں موجود نہ ہوں تو دوسری کتب میں موجود

ہوتی ہیں جیسے مستدرک الحاکم وغیرہ۔

اب ہم یہ کہیں گے کہ اگر یہ احادیث جھوٹی ہیں اور ان کے بارے میں آپ کے علماء کا اختلاف ہے تو ہم پوچھنے کا حق رکھتے ہیں۔ آخر یہ کیوں ہے؟ کیا وہ شیعوں کی طرح تقیہ کے قائل تھے یا شیعوں نے انھیں اختلاف پر مجبور کیا ہے؟ یا پھر شیعوں نے ان کی کتب میں یہ روایات لکھ دی ہیں؟

اگر ان کی یہ روایات صحیح ہیں تو پھر ان روایات کو اپنی کتب صحاح میں شامل کیوں نہیں کیا گیا۔ کیا کسی زمانے میں شیعوں کو ان پر تسلط حاصل ہوا؟ اگر حاصل ہوا تو کب حاصل ہوا؟ تو اب آپ بتائیں ایسی تالیفات قابلِ وثوق ہو سکتی ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ جب ہمارے سامنے کسی حدیث کی سند ضعیف ثابت ہوتی ہے تو اُس سے یہ مراد نہیں ہوتا کہ وہ حدیث جھوٹی ہے۔ اُس سے مراد یہ ہے کہ وہ صحت احتجاج کے لیے مانع ہے۔ ہاں جب وہ حدِ تواتر تک پہنچ جائے یا قرینہ قطعی حاصل ہو جائے تب اُس سے استدلال ہوتا ہے اور وہ حدیث جو ضعیف ہو تو علمی اعتبار سے قبول نہیں کی جاتی۔

کتاب سُلیم بن قیس ہلالی

سوال کچھ لوگ کتاب سُلیم بن قیس کی روایات سے ہم سے احتجاج کرتے ہیں کہ خود شیعہ علماء نے کہا ہے: یہ کتاب اصول شیعہ میں سے ہے اور صحیح ہے۔ کیا واقعی یہ کتاب ہر اعتبار سے صحیح ہے اور اصل الاصول ہے؟

جواب سب سے پہلی بات اس کتاب کے تمام کلمات صحیح نہیں ہیں۔ اس سے یہ مراد ہے کہ اس کی روایات ثقہ ہیں اور اس کتاب کا مؤلف ایک ثقہ انسان ہے اور وہ موضع اعتماد میں ہے۔

لیکن روایات کے لیے آفت اُس کے راوی ہوتے ہیں۔ ایک راوی ہمارے لیے روایت کرتا ہے اور وہ روایت اُس نے اپنے کسی بزرگ سے سنی ہوتی ہے اور وہ بزرگ ہر قسم کے شک سے پاک ہوتا ہے۔ اُس نے کسی غیر سے سنی وہ بھی لاریب تھا۔ یہی غیر اُس روایت کے لیے آفت بن جاتا ہے کیونکہ اس حدیث کے نقل میں دقت سے کام نہیں لیا گیا۔ اس کے نقل میں امانت نہ رہی۔ اس لیے صاحب اصل یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کے تمام راویان جو اس روایت کے سلسلۂ سند میں ہیں، وہ سب ثقہ ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب وہ کہتے ہیں: کتاب صحیح ہے، ان کا صحیح کے ساتھ کتاب کو متصف کرنا، کبھی تو از راہ مؤلف ہوتا ہے اور کبھی از راہ تالیف ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے ایک قسم کی کمزوری سامنے آجاتی ہے۔ ہاں جب مؤلف کی بات ہوگی تو وہاں پورے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ثقہ تھے لیکن ایک بہت بڑا فرق سامنے آجاتا ہے۔ کتاب اور اُس کے مؤلف کے بارے میں کہ مؤلف کی ذات میں کوئی شک نہیں ہے۔ لیکن جب کتاب کی روایات کو دیکھا جائے گا تو سند روایات کا خیال رکھنا لازم ہو جائے گا۔

حدیث کے مضمون کی صحت کے لیے ضروری ہے کہ کوئی حکم اس کی صحت میں مانع نہ ہو۔ یا جہاں سے اخذ کی گئی ہے وہاں بھی کوئی ایسا مانع نہ ہو، تب جا کر مضمون صحیح ہوگا۔

علم کلام

سوال ہمارے پاس لوگ ہیں جو ہم سے اُصولِ کافی کی احادیث کے بارے جھگڑا کرتے ہیں اور ہم پر طعن و تشنیع کرتے ہیں تو ہم اس امر میں ان کا کیا جواب دیں۔ ہماری کتب میں جتنی احادیث ہیں کیا یہ سب صحیح ہیں؟

جواب اس سوال کے جواب میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اصول کافی ہیں یا دوسری کتب احادیث میں جتنی احادیث ہیں، وہ سب صحیح نہیں ہیں۔ کچھ ایسی بھی ہیں جو غیر صحیح ہیں۔

ہاں اگر کوئی حدیث اپنی سند کے لحاظ سے صحیح بھی ہو تو یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کے مضمون کو قبول کرلیا جائے چہ جائیکہ اس پر عقیدہ بھی رکھتے ہوں۔ اس حدیث کے معارضات سے بحث ضروری ہے۔ اس حدیث کو کتاب اللہ کی روشنی میں بھی دیکھا جاتا ہے۔ پھر جب ادلہ قطعیہ، عقلیہ اور نقلیہ سے ثابت ہوجائے تو پھر اُسے قبول کیا جاتا ہے۔ اس کا مضمون بھی صحیح ہو۔ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ وہ مخصوص ہے یا مقید یا معارض وغیرہ وغیرہ۔ پھر جاکر ایسی حدیث سے استدلال کیا جاسکتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہر فرقے کا عقیدہ علمِ کلام کی کتب سے اخذ کیا جاتا ہے۔ ان کتب کو اُس فرقے کے علمائے کبار کی تائید حاصل ہوتی ہے۔ عقیدہ صرف خالی روایت سے اخذ نہیں کیا جاتا اور نہ اُس فرقے کے عام لوگوں کی آراء سے حاصل کیا جاتا ہے۔

تیسری بات ان احادیث کے بارے میں ہے جو احادیث مقبولہ ہیں اور جن سے نتائج کا حصول ہوتا ہے تو اس ضمن میں روایات لاتعداد میں ان کو جاری ہوئے۔ کئی صدیاں گزر چکی ہیں۔ یہ تمام امور حدیث کے قبول کرنے کے راستے میں مانع ہیں۔ اس لیے ان اصول وقواعد کو سامنے رکھا جاتا ہے جن سے حدیث کو پرکھا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں تمام فرقے اس اشکال کی طرف متوجہ ہیں۔

اہلِ سنت کے ہاں تو ہزاروں ایسی احادیث ہیں جو عجائب وغرائب سے بھرپور ہیں۔ ان کے مصائب ان کے لیے کثرت کے ساتھ ہیں۔ ان کتب احادیث کے اندر جو کچھ ہے، ان سب کو صحیح نہیں کہا جاسکتا۔ پھر بھی ان کے ہاں جو کتب احادیث ہیں

ان میں سے کئی ایک کتب کو وہ صحاح میں سے شمار کرتے ہیں کہ ان کے اندر جو کچھ ہے وہ صحیح ہے اور انھیں کتب سے وہ اپنا عقیدہ اخذ کرتے ہیں۔

ان حالات میں کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے حق و نصیحت کو اپنا لیا ہے؟

آخری کلمات

مجھے اپنے قاری سے اُمید ہے کہ وہ اس کتاب میں سوالات کے جوابات کو جب پڑھے گا، کچھ ایسے جوابات ہوں گے جن کو وہ احسن خیال کرے گا۔ کچھ ایسے ہوں گے جو اس کی پریشانی کا باعث ہوں گے۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مختصر ہے۔ اس میں طولانی بحثوں کی گنجائش نہیں ہوسکتی تھی۔ یہ بات تو ہر شخص پر واضح ہے کہ کچھ ایسے سوالات ہوتے ہیں جن کے جواب کا مفصل ہونا ضروری ہے۔ اس کے لیے زیادہ سے زیادہ نصوص اور ادلہ کا پیش کرنا ہے اور مسائل کو پھیلا کر پیش کرنا ہے تا کہ حق حاصل ہو اور شبہات دُور ہوں۔

ان تمام صورتوں میں، مَیں اپنے قاری سے پُر امید ہوں کہ جو مسئلہ اس کے نزدیک قابلِ بحث ہو وہ ضرور ہم تک پہنچائے۔ ہم عصمت کا دعویٰ نہیں کرتے اگر کوئی ہم سے خطا سرزد ہو تو نشان دہی فرمائیں۔

ہم اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اُس کی رحمت کے محتاج ہیں۔ نیک و صالح لوگوں کی دعاؤں میں اثر ہے۔ ہمیں اپنے محترم قاری سے بھرپور اُمید ہے کہ وہ ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔ یہ ان کا ہم پر احسانِ عظیم ہوگا۔ ہماری بارگاہ خداوندی میں دعا ہے کہ ہم پر اپنی نعمات نازل فرمائے اور اپنے فیوض و برکات اور الطافات سے محروم نہ رکھے۔

انه ولی قدیر والحمدللّٰه والصلوٰة والسلام علی عباده

الذین اصطفیٰ، محمد و آله طاهرین

❋......❋......❋